شریعت میں عورت کے قصاص و دیت کا مسئلہ

(جناب خالد اسحٰق صاحب ایڈووکیٹ کے دلائل کا تفصیلی جائزہ)

تحریر جناب مولینا گوہر رحمٰن صاحب - مردان

قتل خطا میں عورت اور مرد کی دیت کے برابر برابر ہونے کے ثبوت میں ملک کے مشہور قانون دان جناب خالد اسحٰق صاحب نے انگریزی زبان میں ایک مضمون لکھا ہے جس کا بڑی محنت اور توجہ سے اردو ترجمہ کر کے برادر مکرم جناب چوہدری محمد اسلم سلیمی صاحب نے مجھے بھیجا ہے۔ اس مضمون کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ دیت کے نصف ہونے کے بارے میں نہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حتمی فیصلہ موجود ہے اور نہ اجماع صحابہ ہوا ہے۔ مبینہ اجماع نام نہاد ہے، حقیقی اجماع نہیں ہے۔

۲۔ اس کے برعکس قرآنِ کریم اور سنّتِ ثابتہ سے دیت کا مساوی ہونا ثابت ہے۔

۳۔ دیت کے نصف ہونے کی عقلی بنیاد خالد اسحٰق صاحب نے عورت کی معاشرتی کمتری بیان کی ہے پھر انہوں نے زور دیا ہے کہ عورت مرد سے کمتر نہیں ہے بلکہ دونوں برابر ہیں۔

۴۔ دیت قصاص کا بدل ہے، لہٰذا جب قصاص میں دونوں برابر ہیں تو دیت بھی برابر ہونی چاہیے۔

۵۔ جس معاشرے میں عورت کی دیت نصف مقرر ہوئی تھی اس میں عورت پر مرد کا تسلط قائم تھا عورت کے حقوق کے لیے کوئی آواز نہیں اٹھاتا تھا اور اس دور کی عورت ذہنی طور پر مستعد بھی نہ تھی اس لیے کوئی احتجاج نہیں ہوا تھا۔ لیکن آج کل عورت معاشرے اور خاندان میں

اپنا رول ادا کرتی ہے اور ذہنی طور پر مستعد ہے۔

۶- ان دلائل کی وجہ سے امت کو ایسا قانون وضع کرنا چاہیے جو عصری ضروریات کو پورا کرتا ہو اور وہ ہے مرد اور عورت کی دیت کا مساوی ہونا۔ اس سلسلے میں بڑے بڑے فقہاء، محدثین اور مفسرین کے حوالے بھی دیئے گئے ہیں جن سے عام قاری اس غلط فہمی کا شکار ہو سکتا ہے کہ یہ تمام حضرات مضمون نگار کی تائید کرتے ہیں۔ مضمون میں بلاضرورت اور بغیر کسی مناسبت کے ایک ہی بات کو بار بار دہرایا گیا ہے، غیر متعلقہ بحثیں بھی چھیڑی گئی ہیں اور مضمون میں کوئی معنوی ربط اور ترتیب بھی نہیں ہے۔

اگرچہ قصاص و دیت کمیٹی منصورہ کے مرتب کردہ مضمون میں درج بالا مبیّنہ دلائل کے جوابات اور نصف دیت کے شرعی اور عقلی دلائل آ گئے ہیں (ترجمان القرآن جون ۱۹۸۴ء)، پھر جولائی ۱۹۸۴ء کے ترجمان میں برادر مکرم عبدالوکیل علوی صاحب نے مزید وضاحت بھی کر دی ہے۔ لیکن خالد اسحٰق صاحب کے مضمون کو پڑھنے کے بعد میں نے خود بھی محسوس کیا کہ اس کا پوری طرح حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے اور برادر مکرم محمد اسلم سلیمی صاحب اور دوسرے بزرگوں نے بھی جائزہ لینے کا مشورہ دیا۔ اس جائزے میں ترتیب تو وہی رکھی گئی ہے جو مضمون کی ترتیب ہے، البتہ عنوانات میں نے لگائے ہیں تاکہ سارے نکات پر علیحدہ علیحدہ تبصرہ کیا جا سکے۔ جتنے نکات اٹھائے گئے ہیں سب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ میراث اور شہادت کا مسئلہ موضوع سے براہ راست متعلق نہیں ہے، اس لیے ضروری اشارات پر اکتفا کیا گیا ہے اور باقی تمام اہم نکات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَہٗ اٰمِیْن۔

تحقیق طلب مسئلے کا تعین

محترم جناب خالد اسحٰق صاحب جیسے مشہور قانون دان کو معلوم ہے ہی کہ تحقیق یا ریسرچ کے لیے مسئلے کا تعین ضروری ہوتا ہے۔ خلطِ مبحث سے ذہنوں میں الجھنیں تو پیدا کی جا سکتی ہیں، لیکن مسئلے کی تحقیق کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔

دراصل یہاں پر پانچ مسئلے ہیں جن کو آپس میں خلط ملط کر کے اصل مسئلے کو الجھا دیا گیا ہے۔

۱- عورت کے قتلِ عمد کا قصاص ۲- ذمی اور مستامن کا قصاص

۳ - عورت کے قتلِ خطا کی دیت   ۴ - عورت کے زخموں کی دیت

۵ - اور ذمی، مستامن اور معاہد کی دیت -

۱ - عورت کا قصاص | قرآن وسنت کی نصوص، اجماعِ صحابہ اور اجماعِ اُمت سب کے سب اس بات پر ناطق ہیں کہ عورت کے بدلے میں مرد کو قتل کیا جائے گا اور مرد کے بدلے میں عورت کو قتل کیا جائے گا - اس لیے کہ دونوں کا خون برابر ہے اور دونوں معصوم الدم اور قابلِ احترام ہیں - اس کی دلیل سورۃ مائدہ کی آیت ۴۵ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ " جان کے بدلے جان " یہ آیت سورۃ بقرہ کی آیت ۱۷۸ کی تفسیر کرتی ہے کہ عورت کے بدلے عورت " کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عورت کے بدلے میں مرد کو قتل نہ کرو بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ قاتل کو قتل کرو جو بھی ہو - اگر قتل عورت نے کیا ہو تو اس کے شوہر یا باپ یا بیٹے کو قتل نہ کرو - دوسری دلیل اس کی وہی حدیث ہے جس کا حوالہ خالد اسحق صاحب نے دیت کے مسئلے میں دیا ہے کہ" مسلمانوں کا خون برابر ہے " اس موضوع پر اور بھی دلائل موجود ہیں -

۲ - ذمی اور مستامن کا قصاص | ذمی سے مراد اسلامی ریاست کا شہری ہے اور مستامن سے مراد وہ "حربی" کافر ہے جو ویزے پر اسلامی ریاست میں عارضی طور پر داخل ہوا ہو - ذمی اور مستامن کو دارالاسلام کی حدود میں اگر کسی مسلمان نے عمداً اور ظلماً قتل کر دیا ہو تو کیا اس مسلمان قاتل کو قصاص میں قتل کیا جائے گا؟ اس بارے میں روایات اور صحابہ کا اختلاف ہے اور اسی وجہ سے ائمہ اربعہ کا بھی اختلاف ہے -

امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک غیر مسلم کے بدلے میں مسلمان کو قتل نہیں کیا جا سکتا بلکہ تعزیری سزا دی جائے گی اور دیت بھی دلائی جائے گی، مگر امام ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ ذمی اور مستامن کے بدلے میں مسلمان سے قصاص لیا جائے گا - دلیل وہی سورہ مائدہ کی آیت ہے - اِنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ" یعنی جان کے بدلے جان " - اس آیت میں مطلق نفس کا ذکر ہے، مسلمان کی تخصیص نہیں ہے - اور سنن دارقطنی وغیرہ میں روایت بھی آئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذمی کے قتل کے بدلے میں مسلمان کو قتل کروایا تھا - زیلعیؒ نے نصب الرایہ میں اس کی تخریج کی ہے اس کے علاوہ روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ ذمیوں کے جان و مال اسی طرح محترم اور معصوم ہیں

جس طرح کہ مسلمان کے جان و مال محترم ہیں۔ نقل اور عقل دونوں کے لحاظ سے حنفیہ کا مسلک صحیح اور قوی تر ہے۔ دوسرے ائمہ کے دلائل کی توجیہات حنفیہ کی کتابوں میں موجود ہیں۔ چونکہ ہمارے اور فاضل مضمون نگار کے درمیان یہ نزاعی مسئلہ نہیں ہے اس لیے اس مسئلے کو مزید تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔

۳۔ ذمی، مستامن اور معاہد کی دیت | ذمی اور مستامن کی تشریح تو کر دی گئی ہے اور معاہد سے مراد اس کافر قوم کا کوئی فرد ہے جس کے ساتھ اسلامی ریاست کا معاہدۂ امن برقرار ہو۔ ذمی، مستامن اور معاہد کے قتلِ خطا کے بدلے میں دیت کا واجب ہونا تو اتفاقی مسئلہ ہے اور سورۃ النساء کی آیت ۹۲ سے صراحتاً و نصاً ثابت ہے۔

"اگر مقتول ایسی غیر مسلم قوم کا فرد تھا جس سے تمہارا معاہدہ ہو (اس میں ذمی اور مستامن بھی شامل ہے)، تو لازم ہے کہ تم پر دیت جو مقتول کے وارثوں کو ادا کی جائے گی"۔

لیکن دیت کی مقدار کا تعین چونکہ قرآن میں ہوا نہیں ہے اور روایات و آراء صحابہ کا اختلاف موجود ہے اس لیے ائمہ اربعہ کا بھی نقطۂ نظر مختلف ہے۔ امام شافعی کی رائے یہ ہے کہ غیر مسلم کی دیت مسلمان کی دیت کا ایک تہائی یعنی ۴ ہزار درہم ہے۔ ان کے نزدیک مسلمان کی کل دیت ۱۲ ہزار درہم ہے۔ امام مالکؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک غیر مسلم کی دیت مسلمان کی دیت کا نصف یعنی ۶ ہزار درہم ہے۔ لیکن امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک غیر مسلم مرد کی دیت وہی ہے جو مسلمان کی ہے یعنی ۱۰۰ اونٹ یا ۱۰ ہزار درہم۔ حنفیہ کا مسلک صحیح اور قوی تر ہے۔ اس کے ثبوت میں احادیث و آثار کی کافی تعداد بھی موجود ہے۔ اور عقلی دلائل بھی موجود ہیں جن کی تفصیل نصب الرایہ، اعلاء السنن اور دیگر مطولات میں موجود ہے اور ائمہ ثلاثہ کی رائے پر تنقید اور ان کے دلائل کے جوابات بھی موجود ہیں۔ یہ مسئلہ بھی ہمارے اور خالد صاحب کے درمیان چونکہ نزاعی نہیں ہے اس لیے تفصیلِ مزید کی ضرورت نہیں ہے۔

۴۔ عورت کے مجروح (زخموں) کی دیت | منصورہ کمیٹی کے مرتب کردہ مضمون میں ائمہ اربعہ کا مسلک تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے کہ عورت کے زخموں کی دیت کے بارے میں روایات و دلائل کے اختلاف کی وجہ سے ائمہ کا بھی اختلافِ رائے موجود ہے۔ امام مالکؒ اور امام احمد کی رائے

یہ ہے کہ عورت کے زخموں اور چوٹوں کی دیت مرد کی کل دیت کے ایک تہائی تک تو وہی ہوگی جو مرد کے زخموں اور چوٹوں کی ہے، لیکن ایک تہائی کے بعد مرد کے زخموں کی دیت کا نصف ہوگی۔ امام شافعیؒ کی قدیم رائے بھی یہی تھی، لیکن ان کی جدید اور آخری رائے وہی بنی تھی جو حنفیہ کی ہے کہ عورت کے زخموں کی دیت بھی قلیل و کثیر دونوں میں مرد کی دیت سے نصف ہے۔ ان آراء کے حوالے اور دلائل جون ۱۹۸۴ء کے ترجمان القرآن میں شائع ہو چکے ہیں۔ اور یہ بات بھی مضمون میں موجود ہے کہ اگرچہ ہمارے نزدیک دلائل کے اعتبار سے حنفیہ کا مسلک مضبوط ہے لیکن چونکہ مسئلہ اختلافی ہے، اس لیے اگر زخموں کی دیت کے مسئلے میں مالکیہ اور حنابلہ کی رائے کے مطابق بھی قانون بنا دیا جائے تو قابلِ قبول ہو سکتا ہے۔ جن روایات کو خالد اسحٰق صاحب باہمی متعارض یا ضعیف کہتے ہیں۔ وہ جروح و شجّات سے متعلق ہیں۔ قتلِ نفس کی دیت کے مسئلے میں ایک روایت یا ایک صحابی کی رائے بھی مخالف موجود نہیں ہے۔ روایات کے اسی تعارض یا ضعف کی وجہ سے احناف اور شافعیہ نے کہا ہے کہ زخموں اور قتل دونوں کا حکم یکساں ہے یعنی نصف دیت۔

۵۔ عورت کے قتلِ خطا کی دیت | یہ ہے وہ اصل مسئلہ جس میں محترم خالد اسحٰق صاحب ائمہ اربعہ اور اُمتِ مسلمہ کے چودہ صد سالہ تعامل سے اختلاف رائے رکھتے ہیں۔ تمام صحابہؓ، تابعین، تبع تابعین (خیر القرون) ائمہ اربعہ، اور سارے فقہاء اور محدثین (بشمول اہلِ ظاہر) کے یک آہنگ نقطۂ نظر کے مطابق چودھویں صدی ہجری تک اُمت کا تعامل اور فتویٰ یہی رہا ہے کہ عورت کے قتلِ خطاء کی دیت نصف ہے، سوائے ابوبکر الاصم اور ابنِ عُلیہ کے کسی دوسرے فقیہ اور محدث کا نام خالد صاحب یا بڑے سے بڑے اجتہاد پسند پیش نہیں کر سکے، جو دیت میں مرد اور عورت کے مساوی ہونے کا قائل ہو۔

اصم اور ابن عُلیہ کے متعلق جون اور جولائی کے ترجمان القرآن میں لسان المیزان کے حوالے سے وضاحت کر دی گئی ہے کہ ابوبکر عبدالرحمان بن کیسان الاصم تو معتزلی تھا جو بدعتی اور گمراہ فرقہ تھا۔ اور کھلے قرینے سے ثابت کیا گیا ہے کہ ابن علیہ سے مراد ابراہیم بن ابن عُلیہ ہے جو جہمی اور بدعقیدہ شخص تھا۔ لیکن اگر یہ دونوں بہت بڑے فقیہ اور امام بھی تسلیم کر لیے جائیں،

اجماع صحابہ کے خلاف ان کی شاذ رائے کا کوئی قانونی جواز نہیں ہے جیسا کہ ابن قدامہ نے المغنی میں لکھا ہے۔

معاذ بن جبلؓ کی حدیثِ مرفوع

خالد اسحٰق صاحب فرماتے ہیں:-

احناف کے مطابق معاذ بن جبل کی ایک روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ عورت کی دیت مرد کی دیت سے نصف ہے۔ اس حدیث کو بیہقی نے ضعیف قرار دیا ہے۔

عورت کے قتل نفس کی دیت کا نصف ہونا چاروں فقہی ائمہ کا مسلک ہے بلکہ اجماعی مسئلہ ہے۔ صرف احناف کا نام لینا اور قارئین کو غلط فہمی میں ڈالنا تحقیق و انصاف کا تقاضا نہیں ہے۔ جہاں تک اس حدیث کے ضعیف ہونے کا تعلق ہے تو اگرچہ اس کا اصولی جواب ترجمان کے جون کے شمارے میں شائع ہو گیا ہے لیکن مزید تفصیل کی ضرورت ہے اور وہ درج ذیل ہے۔

۱۔ بیہقیؒ نے "فیہ ضُعف" کہنے کے بعد اس کی کوئی وجہ بیان نہیں کی اور قاعدہ یہ ہے کہ "جرح غیر مفسّر" یعنی راوی کے عیب کی وضاحت یا کوئی دوسری وجہ بیان کیے بغیر ضُعف کا حکم لگانا قابلِ قبول نہیں ہے۔ جرح کو تعدیل پر اس وقت ترجیح دی جاتی ہے جب واضح قسم کے عیب کی نشان دہی کی گئی ہو۔ اس اُصول کی مزید وضاحت اور دلائل کے لیے درج ذیل کتابوں کی طرف رجوع کیجیے۔

— الکفایہ فی علم الروایہ از خطیب بغدادی متوفی ۴۶۳ھ طبع مدینہ، ص ۱۰۸۔

— علوم الحدیث از ابن الصلاح متوفی ۶۴۳ھ طبع مدینہ منورہ، ص ۹۶۔

— الرفع والتکمیل فی الجرح والتعدیل از مولانا عبدالحی متوفی ۱۳۰۴ھ طبع حلب ص ۹۶ تا ۹۹۔

مولانا عبدالحیؒ نے ابن حجرؒ، حافظ سخاویؒ اور سیوطیؒ کے حوالے سے بڑی تفصیلی گفتگو کی ہے۔

۲۔ بیہقیؒ نے مذکورہ حدیث کو ابراہیم بن طہمان، عن بکر بن خنیس، عن عبادہ بن نُسَی، عن ابن غنم، عن معاذ بن جبل کی سند کے ساتھ نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ عبادہ بن نُسَی سے یہ روایت

دوسری سند کے ساتھ بھی نقل ہوئی ہے، اور وہ ضعیف ہے۔

مولانا ظفر احمد عثمانیؒ لکھتے ہیں، بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ "فیہ ضعف" میں دوسری سند کی جانب اشارہ ہے جو بیہقیؒ نے باب "دِیَةَ السَّمع" میں اس طرح نقل کیا ہے :

رشدین بن سعد، عن عبد الرحمٰن بن زیاد بن انعم الافریقی، عن عتبہ بن حمید، عن عبادہ بن نسی، عن ابن غنم، عن معاذ بن جبل ان النبیؐ قال دفی السمع مأة من الابل (سنن کبریٰ جلد ۸ ص ۸۵)

اس سند میں رشدین اور ابن زیاد آئے ہیں۔ جن بیہقیؒ نے متعدد مقامات پر ضعیف قرار دیا ہے۔ عورت کی دِیَت کے بارے میں بھی دوسرا سلسلۂ اسناد یہی ہوگا جو رشدین اور ابن زیاد کی وجہ سے ضعیف ہے عبادہ بن نُسی کی وجہ سے نہیں (اعلاء السنن جلد ۱۸ ص ۱۲۹)۔

عُبادہ بن نُسَی کے بارے میں تو ابن حجر لکھتے ہیں فاضِلٌ ثِقَةٌ۔ یعنی ثقہ اور فاضل تھے۔ (تہذیب التہذیب فی الکنیٰ ۱۷۳۸ھ)

۳ ۔ اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ سنداً یہ حدیث راویوں کے دونوں سلسلوں کے اعتبار سے ضعیف ہے، پھر بھی درایتاً یہ قابلِ استدلال ہے، اس لیے کہ اس کو "تَلَقِّی بالقبول" حاصل ہے، یعنی سلفِ صالحینؒ اور صحابہؓ و تابعینؒ نے اس پر عمل کیا ہے اور اُمت کا تعامل اسی کے مطابق رہا ہے۔ امام جصاص فرماتے ہیں :

"تلقی بالقبول اور تعاملِ اُمت کی وجہ سے خبرِ واحد بھی متواتر حدیث کا مقام حاصل کر لیتی ہے۔" مثلاً حضرت عائشہؓ اور ابنِ عمرؓ سے مروی یہ حدیث کہ "لونڈی کی طلاق کی آخری حد دو ہے اور اس کی عدت دو حیض ہیں" یہ اگرچہ خبرِ واحد ہے، بلکہ بقول ترمذی غریب بھی ہے، لیکن اُمت کے تعامل کی وجہ سے بمنزلہ حدیث متواتر ہے۔" (احکام القرآن جلد ۱ ص ۳۸۶)

امام ترمذیؒ نے بغیر عذر (سفر اور مرض) کے جمع بین الصلاتین سے ممانعت کی حدیث نقل کر کے اسے ایک راوی کی وجہ سے ضعیف قرار دیا ہے، لیکن ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ "والعمل علیہ عند اھل العلم۔ اہلِ علم کا عمل اس کے مطابق ہے۔ اسی طرح

لا وصیۃ لوارثٍ اور لا یرث القاتل " یعنی " وارث کے حق میں وصیت نافذ نہیں ہوگی " اور " قاتل مقتول کی میراث نہیں لے سکتا "۔ یہ دونوں حدیثیں بھی سنداً کمزور ہیں، لیکن تعاملِ امت کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ قابلِ قبول ہیں بلکہ بمنزلہ حدیث متواترہ ہیں۔ صرف سنن ترمذی ہی سے اگر ایسی حدیثیں جمع کی جائیں جو سنداً ضعیف ہونے کے باوجود تعامل کی وجہ سے صحیح اور مقبول سمجھی گئی ہیں تو ضخیم تصنیف بن سکتی ہے۔ ابن الہمام لکھتے ہیں۔

امام ترمذیؒ کے اس قول کہ والعمل علیہ عند اهل العلم " کے معنی یہی ہیں کہ یہ حدیث سنداً ضعیف ہونے کے باوجود قابلِ استدلال ہے۔ اس لیے کہ اس پر سلف کا عمل رہا ہے "۔ (فتح القدیر جلد ۱ - ص ۲۱۷)

مولانا عبدالحی لکھنویؒ نے " الاجوبۃ الفاضلۃ " میں اس قاعدے کی بڑی اچھی تفصیل بیان کی ہے۔ اور مولانا ظفر احمد عثمانی نے بڑی تفصیل کے ساتھ مستند کتابوں سے مثالیں دے کر اس قاعدے کو ثابت کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے: مقدمۂ اعلاء السنن فی قواعد علوم الحدیث ص ۲۹ تا ۴۰ یہی وجہ ہے کہ بیہقی نے ضعیف کہنے کے باوجود عمل اسی پر کیا ہے کہ عورت کی دیت نصف ہے۔ مذکورہ قاعدے کی روشنی میں عورت کی دیت نصف ہونے کی حدیث نہ صرف یہ کہ مقبول ہے، بلکہ حدیثِ متواتر کے درجے کی حدیث ہے اس لیے کہ مؤید بالتعامل ہے۔

زید بن ثابت کی روایت

خالد اسحٰق صاحب لکھتے ہیں:۔

" دوسری روایات جن کی رو سے زید بن ثابت کے مطابق جروح میں ۱/۳ کی حد تک تو دیت برابر ہے اور اس کے بعد نصف ہے، وہ بھی منقطع ہے، یعنی ان کی روایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک نہیں پہنچتی "۔

جناب کی خدمت میں عرض ہے کہ جو روایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک نہ پہنچتی ہو، بلکہ کسی صحابی کا قول یا عمل ہو اُسے منقطع نہیں کہتے بلکہ " حدیث موقوف " کہتے ہیں۔ " منقطع " اُسے کہتے ہیں، جس کی سند قائل تک متصل نہ ہو، بلکہ درمیان میں کوئی راوی ساقط ہو گیا ہو۔

زیلعیؒ نے نصب الرایہ جلد ۴ ص ۳۶۴ میں اور دیگر حنفی فقہاء و محدثین نے زید بن ثابت کی اس روایت کو اس وجہ سے منقطع نہیں کہا کہ یہ رسول اللہ کا قول نہیں ہے، بلکہ اس بنا پر کہا ہے کہ ان کے خیال میں زیدؓ تک سند متصل نہیں ہے۔ یہ تو بھی ایک فنی اور اصطلاحی غلطی جس کی نشاندہی مفید ہوگی۔

لیکن سوچنا یہ چاہیے کہ کیا احناف نے اس نوع کی روایات کی تضعیف اس لیے کی ہے کہ وہ دیت کی برابری ثابت کرنا چاہتے ہیں؟ وہ تو قتل اور جروح دونوں میں نصف دیت کے قائل ہیں۔ یہ مسلّم بات ہے کہ جروح کی دیت کا مسئلہ اختلافی ہے۔ اصل زیر بحث مسئلہ تو قتلِ نفس کی دیت کا ہے۔ زیدؓ بن ثابت کی روایت کا تو اس مسئلے سے دُور کا تعلق بھی نہیں ہے۔ حیرت ہے کہ ہمارے ایک ذہین قانون دان دوست کے ذہن میں یہ کھلی اور صاف نظر آنے والی بات کیوں نہیں آئی؟

ربیعۃ الرأی اور سعید بن المسیب کا مکالمہ

امام مالکؒ کے شیخ ربیعۃ الرای نے جب زخموں کی دیت کے مسئلے میں ۱/۳ کی حد تک برابر ہونے اور اس کے بعد عورت کی دیت کے نصف ہونے پر اپنی الجھن کا ذکر کیا تو سعیدؒ نے فرمایا یہ تو سنت ہے میرے بھائی (سنن کبریٰ جلد ۸ - ص ۹۶ مصنف عبدالرزاق جلد ۹ - ص ۳۹۴ وغیرہما)۔

اس روایت کے بارے میں خالد صاحب فرماتے ہیں: "شوافع اس روایت سے مدد حاصل کرتے ہیں"۔ جنابِ والا! بڑے ادب سے عرض کرتا ہوں کہ فقہی مسالک نقل کرنے میں بڑی محنت اور کاوش کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس روایت سے شافعیؒ مدد حاصل نہیں کرتے، بلکہ امام مالکؒ اور امام احمد مدد حاصل کرتے ہیں۔ سنن کبریٰ کے جس صفحے پر یہ روایت موجود ہے اسی پر امام شافعیؒ کا یہ قول بھی منقول ہے کہ "وقد کنا نقول به علی المعنی ثم وقفت عنه" ص ۹۶۔ ترجمہ: "پہلے ہم بھی اس کے قائل تھے کہ ۱/۳ تک دیت برابر ہے لیکن بعد میں میں نے اس سے رجوع کر لیا"۔ امام شافعیؒ نے اس روایت کا وہی جواب دیا ہے جو حنفیہ نے دیا ہے کہ سنت سے مراد اہلِ مدینہ کی سنت ہے سنتِ رسولؐ نہیں ہے۔ التلخیص الحبیر جلد ۴ - ص ۲۵ - نیل الاوطار جلد ۷ - ص ۲۲۵)۔

اہلِ مدینہ کی سنّت اور تعامل کو امام مالکؒ حجت ملنتے ہیں، مگر حنفیہ اور شافعیہ صرف اہلِ مدینہ کے تعامل اور سنّت کو حجت تسلیم نہیں کرتے۔ امام شافعیؒ کا آخری فتوٰی خود ان کی اپنی تصنیف کتاب الاُم میں موجود ہے کہ قتل اور ہر قسم کے زخموں میں عورت کی دیت نصف ہے، ۱/۳ کی حد تک بھی مساوات نہیں ہے (الام جلد ۶ - ص ۱۰۶) - حنابلہ اور مالکیہ کہتے ہیں کہ دیت کی مقدار کوئی عقل سے معلوم ہونے والی چیز نہیں ہے، بلکہ سماعی اور نقلی چیز ہے اس لیے زیدؓ بن ثابت نے یہ بات رسول اللہ سے سُن کر کہی ہوگی تو یہ حکماً مرفوع ہے، اگرچہ سنداً موقوف ہے - حنفیہ اور شافعیہ جواب میں کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کا فتوٰی یہ ہے کہ قتل اور زخموں دونوں کی دیت نصف ہے اس لیے ہم ان کی رائے کو راجح سمجھتے ہیں - معلوم ہوا کہ زخموں میں ۱/۳ کی حد تک برابری کا مسئلہ صحابہ اور ائمہ اربعہ میں اختلافی ہے - جناب خالد صاحب ائمہ اربعہ کے درمیان محاکمہ کرنے کی صلاحیت کو کام میں لاکر جس رائے کو بھی چاہیں اختیار کرلیں، لیکن قتل کی دیت کے مسئلے کے ساتھ اس روایت کا آخر کیا تعلق ہے؟ یہ اگر خلط مبحث نہیں ہے تو اور کیا چیز ہے؟

زیلعیؒ، سرخسیؒ اور عثمانیؒ کے حوالے

ان بڑے بڑے فقہاء حنفیہ کے نام جب لوگ پڑھیں گے تو اس غلط فہمی کا شکار ہو جائیں گے کہ شاید یہ حضرات بھی خالد اسحٰق صاحب کی رائے کی تائید کرتے ہیں - حالانکہ ان بزرگوں اور ائمہ فقہ نے ۱/۳ کی حد تک مساوات والی روایات کو ضعیف، خلافِ قیاس اور خلافِ عقل کہا ہے اور یہ حضرات مطلق دیت میں نصف ہونا ثابت کرتے ہیں - خالد صاحب کے اجتہادی نقطۂ نظر کے سامنے ان فقہاء کرامؒ سے نقل کردہ اقتباسات کا کیا تعلق؟

قاضی شوکانیؒ کا حوالہ

خالد اسحٰق صاحب فرماتے ہیں کہ "شوکانی نے نیل الاوطار میں ان روایات کے اندرونی تضادات کی نشاندہی کی ہے جن کے نتائج اثر آفرین ہیں - جلد ۷ - ص ۷۰"

یہ طرزِ استدلال ہمارے یہاں اُغْلُوطَۃ کہلاتا ہے جسے حدیث میں ممنوع قرار دیا گیا ہے -

اصل بات یہ ہے کہ شوکانی مالکیہ اور حنابلہ سے اس بات پر متفق ہیں کہ ۱/۳ تک مرد اور عورت دونوں کی دیت برابر ہے (جروح میں) اور اس کے بعد جروح کی دیت بھی نصف ہے۔ اس لیے ۱/۳ تک مساوات ہے اور اس کے بعد نصف ہونے پر دلالت کرنے والی روایات پر جو عقلی اعتراضات وارد ہوئے ہیں۔ اس کے جواب میں شوکانی نے توجیہات کی ہیں۔ تضادات کو رفع کرنے کے لیے، نہ کہ تضادات کو ثابت کرنے کے لیے۔ باقی رہا "اثر آفریں نتیجہ" تو شوکانیؒ نے اس کا ذکر ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

یمکن الجمع بینہ و بین حدیث الباب اما لحملہ علی الدیۃ الکاملۃ کما ھو ظاہر اللفظ و ذالک مُجْمَعٌ علیہ کما حکاہ فی البحر فی موضعین (جلد ۷۔ ص ۲۲۷) ترجمہ: معاذ کی حدیث اور اس باب کی حدیث میں پوری دیت مراد ہے، (جس میں عورت کی دیت نصف ہے) جیسا کہ اس کے ظاہری الفاظ سے معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ تو متفقہ مسئلہ ہے اور اس باب کی حدیث میں زخموں کی ۱/۳ کی دیت مراد ہے جس میں دونوں برابر ہیں" (نیل الاوطار باب دیۃ المراۃ فی النفس وما دونہا جلد ۷۔ ص ۲۲۴ تا ۲۲۷۔)[1]

کیا اس اثر آفریں نتیجے کو خالد صاحب تسلیم کرتے ہیں تو چشم ما روشن، دلے ما شاد۔ کہہ دیں کہ عورت کے قتل کی دیت تو نصف ہے اور زخموں کی دیت ۱/۳ کی حد تک برابر ہے اور اس کے بعد زخموں کی دیت بھی مرد کی دیت سے نصف ہے۔ یہی شوکانی کی رائے ہے۔ اگر آپ اس کے لیے تیار نہیں ہیں تو پھر شوکانی کا نام لے کر لوگوں کے ذہنوں میں الجھنیں پیدا کرنے اور طے شدہ اجماعی مسئلے کو اختلافی بنانے کی سعئ لاحاصل کیوں فرماتے ہیں؟ آپ اس نوع کے اغلوطوں سے بلند تر رہیے۔

[1] معلوم نہیں خالد اسحٰق صاحب کے سامنے کونسا نسخہ ہے کہ انہوں نے جلد ۷۔ ص ۷۰ کا حوالہ دیا۔

(صاحبِ مضمون)

عمرو بن حزم کی روایت

خالد اسحٰق صاحب فرماتے ہیں:

مندرجہ بالا دونوں نظریات کی مزید تردید درج ذیل احادیث سے ہو جاتی ہے کہ "عمرو رضؓ بن حزم کو اپنی ہدایات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نفسِ مومنہ کی دیت سو اونٹ ہے۔

لفظِ "مزید تردید" سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا روایات سے بھی اس کی تردید ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ درج بالا روایات میں قتل کی دیت کے نصف ہونے کی تردید کہاں ہے؟ عمرو بن حزم کی یہ روایت صحیح ہے لیکن دوسری روایات نے اس کے عموم میں تخصیص کر دی ہے۔ معاذ رضؓ بن جبل کی متداول اور مؤید بالتعامل حدیثِ رسولؐ سے معلوم ہوتا ہے کہ عمرو بن حزم کی روایت میں "نفسِ مؤمنہ" یعنی مومن انسان کی جان سے مراد مرد ہے عورت نہیں ہے، جب کہ اس کی تائید میں حضرت عمر رضؓ کا فتوٰی اور صحابہ و تابعین کا عمل بھی موجود ہے۔ آیات و احادیث کا مفہوم دوسری آیات و احادیث کی روشنی میں متعین کرنا چاہیے ورنہ یک طرفہ مطالعہ کرنے سے شدید ترین غلطیوں میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہے۔

"فی النفس المومنة مائة من الابل" کا جملہ عمرو بن حزم سے مروی جس مکتوبِ نبویؐ میں آیا ہے، ابن قدامہ حنبلی کہتے ہیں کہ "اسی مکتوبِ نبوی میں رسول اللہؐ کا یہ ارشاد بھی نقل ہوا ہے کہ "دیة المرأة على النصف من دية الرجل" یعنی عورت کی دیت مرد کی دیت سے نصف ہے۔ ایک ہی روایت میں یہ ارشاد نبویؐ پہلے ارشاد (سو اونٹ) کی تخصیص اور تفسیر کرتا ہے" ایک حصّے کو لے کر دوسرے کو چھوڑا کیسے جا سکتا ہے؟ جلد ۸ ص ۴۰۲ - المغنی لابن قدامہ مسئلہ نمبر ۶۸۵۰ -

نصب الرایہ کتاب الزکوٰۃ میں عمرو بن حزم کا جو مکتوب نقل ہوا ہے اس میں تو یہ اضافہ میری نظر سے نہیں گزرا لیکن ابن قدامہ عظیم محدث اور فقیہ ہیں۔ اس نے جب اس کا ذکر کیا ہے تو انہوں نے کسی مآخذ سے معلوم کر کے ہی لکھا ہوگا۔ اس متقن محدث کی روایت پر اعتماد نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے بالخصوص جب اس کی تائید میں معاذ بن جبل کی حدیث مرفوع اور دیگر روایات موجود ہیں لیکن عورت اور مرد کی دیت کے مساوی ہونے کے لیے ایک بھی صریح روایت موجود نہیں ہے۔

مومنوں کے خون مساوی ہیں

خالد صاحب نے مصنف ابن ابی شیبہ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ المؤمنون تتکافأ دماؤھم (یعنی مسلمانوں کے خون برابر ہیں)، لیکن یہ حدیث سنن ابی داؤد کتاب الدیات باب ایقاد المسلم بالکافرین اور سنن نسائی کتاب القود باب سقوط القود بین المسلم للکافرین بھی حضرت علیؓ کی روایت سے نقل ہوئی ہے۔ یہ حدیث حضرت علیؓ کے پاس لکھی ہوئی بھی موجود تھی جسے انھوں نے اپنی تلوار کے نیام میں محفوظ رکھا تھا۔ امام بخاریؒ نے اپنی تاریخ کبیر میں حضرت عائشہؓ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ کی تلوار کے نیام میں بھی یہ حدیث بعض دوسری حدیثوں کے ساتھ لکھی ہوئی پائی گئی تھی۔ (نصب الرایہ از زیلعیؒ جلد۴۔ ص ۳۳۴ باب مایوجب القصاص) یہ حدیث مسند احمدؒ اور مستدرکِ حاکم اور منتقی الاخبار از مجدد الدین ابن تیمیہ میں بھی نقل کی گئی ہے۔ ابن حجر اور شوکانی نے اس کو مقبول حدیث قرار دیا ہے (اعلاء السنن جلد ۱۸، ص ۱۰۶۔ باب قتل الحر بالعبد)

حدیث تو یہ بالکل صحیح ہے، لیکن اس کا تعلق قصاص سے ہے دِیَت سے نہیں ہے، کیونکہ قصاص "جان کے بدلے جان" کا نام ہے اور جان اور خون مرد اور عورت آزاد اور غلام اور مسلمان اور ذمی سب کا واجب الاحترام ہے اور مساوی ہے۔ لیکن دیت پس ماندگان کی مالی امداد ہے۔ خون اور جان کی قیمت نہیں ہے۔ آزاد مرد، آزاد عورت اور آزاد ذمی قابلِ فروخت مال نہیں ہے جس کی قیمت شریعت نے دیت کے نام سے مقرر کی ہے۔ زندہ غلاموں کی تو فروخت ہوتی تھی، لیکن لاش[1] تو کسی کی بھی قابلِ فروخت نہیں ہے۔ احناف نے اس حدیث کو غلام کے بدلے میں آزاد سے قصاص دلانے کے ثبوت میں پیش کیا ہے جس سے بعض دوسرے فقہا انکار کرتے ہیں۔ مولانا ظفر احمد عثمانیؒ لکھتے ہیں:

والظاھر ھو التکافؤ فی القصاص علی ما یدل علیہ الاصل

---

[1] مولانا سے گزارش ہے کہ آج کل کے نباش کفن کے بجائے لاشیں چرا کر طبی تجربات کے لیے بیچتے ہیں۔ (مدیر)

الذی ھو مبنی القصاص وھو کون المقتول معصوم الدم ...... مع کون القتل عمداً" (ترجمہ: اس حدیث کا ظاہری مفہوم قصاص میں مساوات اور برابری ہے۔ جیسا کہ وہ قاعدہ اس پر دلالت کرتا ہے جس پر قصاص بنی ہے۔ یعنی مقتول کا معصوم الدم اور قتل کا عمداً ہونا۔ (اعلاء السنن جلد ۱۸ - ص ۱۰۶ - باب قتل الحر بالعبد)

اختلافِ آراء کا دعویٰ

موصوف مذکور فرماتے ہیں:

"مزید برآں ہمارے پاس مصنف عبدالرزاق اور مصنف ابن ابی شیبہ ہیں بہت سی روایات ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس مسئلے پر آراء کا اختلاف پایا جاتا ہے ...... اگر حضورؐ کا واضح فیصلہ ہوتا تو یہ اختلاف رائے جو ابتدائی کتابوں میں ٹھوس طور پر پایا جاتا ہے وہ ظاہر نہ ہوتا۔"

یہ دونوں کتابیں میرے سامنے بھی ہیں۔ "ٹھوس طور" پر نہ سہی کوئی ضعیف روایت ہی میرے سامنے لے آیئے، جس میں کسی صحابی کی رائے موجود ہو کہ عورت سے قتلِ خطا کی دیت مرد کی دیت سے نصف نہیں بلکہ برابر ہے۔ جناب والا! اختلافِ آراء زخموں کی دیت میں پایا جاتا ہے، قتلِ نفس کی دیت میں اختلافِ آراء نہیں، بلکہ اتفاقِ آراء پایا جاتا ہے، اس لیے کہ اس مسئلے میں رسول اللہ کا واضح فیصلہ موجود ہے جو درج بالا سطور میں بیان کر دیا گیا ہے۔

براہِ کرم آپ ملک کے ہزاروں علماء اور ماہرینِ علومِ دینیہ کو آپ ایسے خبر اور ان پڑھ تو نہ سمجھ لیں کہ ان میں سے کوئی بھی آپ کے اس غلط مبحث اور خیالی و تصوراتی دعووں کو سمجھ نہ سکے گا۔

اجماع کے ثابت نہ ہونے کا دعویٰ

محترم خالد اسحٰق صاحب نے عورت کے قتل کی دیت کے نصف ہونے پر اجماع کے متعلق کاشانیؒ سے حوالہ نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ "کاشانیؒ کا بیان درست نہیں ہے کیونکہ مصنف

عبدالرزاق اور مصنف ابن ابی شیبہ میں اس کے خلاف روایات موجود ہیں" اور اس کے بعد، روایات عبدالرزاق سے اور ایک روایت ابن ابی شیبہ سے نقل کی ہے۔

سب سے پہلے تو مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اجماع قتل نفس کی دیت کے مسئلے میں ہے جروح و شجاج کی دیت کے مسئلے میں اجماع کا دعویٰ نہ کسی نے کیا ہے (۱/۳ کی حد تک) اور نہ اجماع ثابت ہے، درآنحالیکہ زیرِبحث مسئلہ قتل کی دیت کے نصف ہونے کا ہے۔ دوسری عرض یہ کرنی ہے کہ آپ نے کاشانی کا حوالہ دیا ہے۔ (شاید اجماع کے دعوے کو انفرادی رائے ثابت کرنے کے لیے) حالانکہ اجماع کا ذکر ابن جریر طبریؒ، ابن جوزیؒ، شمس الائمہ سرخسیؒ، ابن رشد مالکیؒ، امام شافعی، عبدالقادر عودہؒ، علامہ سید سابقؒ، علامہ عبدالرحمٰن الجزائریؒ اور دیگر بہت سے دیگر محدثین اور فقہا نے اپنی اپنی کتابوں میں کیا ہے صرف کاشانی نے نہیں کیا۔ (حوالوں کے لیے دیکھیے: ماہنامہ ترجمان القرآن جون ۱۹۸۴ء ص ۳۹ تا ۴۳)

اس اجماع کی بنیاد حضرت عمرؓ کا نافذ کردہ وہ قانون ہے جس میں انھوں نے عورت کی دیت ۵۰ اونٹ یا ۶ ہزار درہم مقرر کی تھی۔ اس قانون کی تائید حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباسؓ اور عبداللہ بن عمرؓ نے کی تھی اور مخالفت کسی نے بھی نہیں کی تھی۔ (حوالوں کے لیے دیکھیے: ترجمان القرآن۔ ص ۳۷ - ۳۸۔ شمارہ جون ۱۹۸۴ء۔)

دیت کے اس قانون سے نہ صرف خلافتِ فاروقی میں کسی نے اختلاف نہیں کیا تھا بلکہ بعد کے ادوار میں بھی کسی صحابی اور تابعی اور تبع تابعی نے اختلاف نہیں کیا۔ اور چودہ سو سال تک ہر صدی کے فقہا نے اِس اجماع کو نقل کیا ہے اور اس پر تعامل رہا ہے۔ یہ اجماع ہی نہیں بلکہ صحابہ کرام اور اُمت کا تعامل ہے جو قرناً بعد قرنٍ ہم تک پہنچا ہے۔ اگر ایسا اجماع مؤید بالتعامل اور منقول "بتواترِ طبقۃٍ عن طبقۃٍ" حجت نہیں ہے تو پھر بتائیے کہ آپ کا اطمینان کس قسم کی دلیل سے ہوگا؟

مُصنّف عبدالرزاق اور مُصنّف ابن ابی شیبہ کے حوالوں کی حقیقت

امام عبدالرزاقؒ نے المصنّف جلد نہم میں المرأۃ تُقتَلُ بالرجل کے عنوان سے باب قائم کیا ہے اور اس کے تحت ۱۰ روایات نقل کی ہیں (نمبر ۱۷۹۷۳ تا ۱۷۹۸۲) اور ایک روایت (نمبر ۱۷۹۸۰)

میں دیت کا ذکر ہے کہ چھ ہزار یعنی نصف ہے اور ایک روایت (نمبر ۱۷۹۷۶) میں ہے کہ عورت کا قصاص مرد سے لیا جائے گا۔ لیکن اگر مقتول کے وارثوں نے صلح کر لی تو صلح میں طے شدہ رقم اگر شریعت کی مقررہ دیت سے زائد ہو تو وہ زائد رقم عاقلہ پر واجب نہیں ہے بلکہ قاتل خود ادا کرے گا۔ باقی ساری روایات میں قصاص کا ذکر ہے کہ مرد کو عورت کے قصاص میں قتل کیا جائے گا اور عورت کو مرد کے قصاص میں قتل کیا جائے گا۔ کسی ایک روایت میں اشاروں کنایوں میں بھی یہ نہیں آیا کہ عورت کے قتلِ خطا کی دِیت مرد کی دِیت کے برابر ہے۔ البتہ ایک روایت ایسی ہے جس میں ۶ ہزار کا ذکر آیا ہے، جو مرد کی دیت کا نصف ہے۔ برادرِ مکرم عبدالوکیل علوی نے اِن روایات کو متن اور ترجمے دونوں کے ساتھ جولائی ۱۹۸۲ء کے ترجمان میں نقل کر دیا ہے۔ میں اِس سے قاصر ہوں کہ خالد صاحب کے دعوائے اختلاف اور طریقۂ استدلال کو سمجھ سکوں۔

ابن ابی شیبہ کی جس روایت کا حوالہ دیا گیا ہے اس میں تو اس کے اپنے کیے ترجمے میں صاف صاف ذکر کیا گیا ہے کہ "مرد اور عورت کی دِیتیں مختلف ہوتی تھیں، اگرچہ قتل کے معاملے میں وہ برابر سمجھے جاتے تھے۔" یہی تو ہم کہتے ہیں کہ دِیت میں برابری نہیں ہے، بلکہ قصاص میں برابری ہے۔ ایسی کچی، سطحی اور غیر متعلق باتوں کا فاضل ایڈووکیٹ جناب خالداسحٰق صاحب کے نوٹ میں موجود ہونا خود میرے لیے وجہ شرمساری ہے۔ مجھے ان باتوں کا جواب دینا بھی تحصیل لا حاصل نظر آتا ہے۔ افسوس ہے کہ آج کل ایسی باتوں کو بھی مخصوص قسم کا طبقہ سند سمجھنے لگا ہے۔ علمِ دین اور تحقیق و استدلال کی اس بے وقعتی کا آخر کیا علاج! بس چار و ناچار دینی اقدار اور احکام کے تحفظ کے لیے وضاحت کرنی پڑتی ہے۔

عورت کے سَرِپستان کی دِیت

خالداسحٰق صاحب نے زیرِ بحث مسئلے سے غیر متعلق ایک روایت مصنّف عبدالرزاق سے نقل کی ہے (نمبر ۱۷۵۸۶ - جلد ۹ ص ۳۶۳) کہ حضرت ابوبکرؓ نے عورت کی چھاتی کے ضیاع پر سو دینار اور مرد کی چھاتی کے ضیاع پر پچاس دینار دلوائے تھے"۔ چھاتی کے ضیاع پر نہیں، بلکہ چھاتی کی بالائی نوک (سرپستان) کے ضیاع پر دلوائے تھے۔ روایت کے اصل الفاظ یہ ہیں:

عبد الرزاق، عن معمر، عن رجل، عن عکرمۃ، ان ابا بکرؓ جعل فی حلمۃ الرجل خمسین دینارا و فی حلمۃ المرأۃ مئۃ دینار۔

حلمہ پورے پستان کو نہیں کہتے، بلکہ سرِ پستان کو کہتے ہیں۔ پوری چھاتی کو ثَدْی کہتے ہیں۔ عورت کے قتل کی دیت کے مسئلے سے تو اس روایت کا سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے، مزید یہ کہ یہ روایت قابلِ استدلال بھی نہیں ہے۔ سند میں معمر کسی نامعلوم شخص سے روایت کرتے ہیں۔ ایسی روایت ضعیف اور ناقابلِ قبول ہوتی ہے۔

روایت نمبر ۱۷۵۸۸ میں عمرو بن شعیب ابو بکرؓ سے یہ فیصلہ نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے مرد کی چھاتی کے سر کے ضیاع پر ۵ اونٹ دلوائے تھے اور روایت نمبر ۱۷۵۹۴ میں یہی عمرو بن شعیب ابوبکرؓ کا فیصلہ یوں نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے عورت کے سرِ پستان کے ضیاع پر ۱۰ اونٹ اور پوری چھاتی کو کاٹنے پر ۱۵ اونٹ دلوائے تھے۔ یہ دونوں روایتیں مُعضَل ہیں (منقطع کی ایک قسم) اس لیے کہ عمرو بن شعیب کی ملاقات اور سماعِ حدیث ابوبکرؓ سے ثابت نہیں ہے۔ یہ تو ہوئی اس روایت کی اسنادی حیثیت، لیکن عورت اور مرد کی چھاتیاں کاٹنے یا اُن کی چھاتیوں کے سروں کو کاٹنے کا معاوضہ اور دیت کتنی ہے؟

ابن قدامہ لکھتے ہیں:۔

عورت کے دونوں پستانوں کے ضیاع کی دیت پوری ادا کرنی ہوگی (یعنی عورت کے قتل کی پوری دیت ۵۰ اونٹ یا ۵ ہزار درہم) اس بارے میں ہم کو اہلِ علم کا اختلاف معلوم نہیں ہے۔ اور ایک پستان کے ضیاع پر آدھی دیت ادا کرنی ہوگی (یعنی ۲۵ اونٹ یا اڑھائی ہزار درہم) ابن منذر نے کہا ہے کہ جن اہلِ علم کی آراء ہم نے یاد کر رکھی ہیں اُن سب کی رائے یہی ہے کہ عورت کی ایک چھاتی کی دیت آدھی ہے اور دونوں کی دیت پوری ہے۔ مثلاً حسن بصریؒ، شعبیؒ، زُہری، مکحولؒ، قتادہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور اصحاب الرائے (حنفیہ)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عورت کا حُسن و جمال (نسوانیت) دونوں پستانوں میں ہے اور منفعت (بچے کا دودھ) بھی دونوں میں ہے

اس لیے ایک کے ضیاع پر آدھی دیت اور دونوں کے ضیاع پر پوری دیت واجب ہو جاتی ہے (پستانوں کا ضیاع عورت کے لیے بمنزلہ قتل ہے) اور دونوں پستانوں کے سروں (حلمتین) کے کاٹنے پر بھی دونوں پستانوں ہی کی دیت واجب ہو گی۔ امام احمدؒ نے اس بات کو صراحتاً کہا ہے اور امام شافعیؒ کی بھی یہی رائے ہے (امام ابوحنیفہؒ اور اس کے شاگردوں کی بھی یہی رائے ہے)۔ لیکن امام مالکؒ اور سفیان ثوری کی رائے یہ ہے کہ اگر پستانوں کے سروں کو اتنا نقصان پہنچا تھا کہ دودھ ختم ہو گیا تھا تو دیت واجب ہو گی (دونوں کی پوری اور ایک کی آدھی) لیکن اگر دودھ ضائع نہیں ہوا تھا (معمولی سی کاٹ اور زخم تھا) تو پھر عادل شخص مناسب معاوضہ عاید کرے گا کوئی دیت مقرر نہیں ہے۔" (المغنی جلد ۹ ص ۶۲۴)

مرد کی چھاتی کی چونکہ وہ حیثیت نہیں ہے جو عورت کے پستانوں کی ہے۔ مرد کے حسن و جمال میں بھی ان کے ضائع ہونے سے کچھ زیادہ فرق نہیں، اس کی مردانگی بھی کچھ زیادہ متاثر نہیں ہوتی اور اس کی منفعت بھی ختم نہیں ہوتی اس لیے اس کا تاوان بھی عورت کی چھاتی یا سرپستان سے کم عاید ہوتا ہے۔

"امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کا مسلک مشہور یہ ہے کہ مرد کے پستانوں یا سرپستان کے ضیاع میں دیت مقرر نہیں ہے بلکہ حاکم اور قاضی جو مناسب سمجھے عاید کر سکتا ہے"۔ (المغنی جلد ۹ ص ۶۲۵)

حضرت ابوبکرؓ کے جس فیصلے کا حوالہ خالد اسحٰق صاحب نے دیا ہے اس میں تو دوسرے صحابہؓ اور تابعین و ائمہ کی رائے کے مطابق ۱۰۰ دینار دلوانا حق سے کم تھا۔ اور اگر ایک پستان کا سر مکمل ضائع ہوا تھا تو اڑھائی سو دینار دلوانے تھے۔ اور اگر دونوں ضائع ہوئے تھے تو ۵۰۰ دینار دلوانے تھے، البتہ مرد کے سرپستان کی دیت مقرر نہیں ہے، اس لیے ابوبکرؓ نے جو مناسب سمجھا، دلوا دیا یہ گفتگو اس صورت میں درست ہو گی جب کہ روایت صحیح ہو ورنہ جیسا کہ بیان کر چکا ہوں روایت صحیح بھی نہیں ہے۔ خالد صاحب! آپ جیسے مشہور قانون دان سے ہماری بجا طور پر امیدیں ہیں کہ قانونی جزئیات اور قانونی امتیازات پر آپ کی نگاہ گہری ہونی چاہیے۔ بغیر اس کے پیچیدہ مسائل

کے میدان میں داخل ہو کر آپ یا تو خود پریشان ہوں گے یا دوسروں کو پریشان کریں گے۔ شریعت کا معاملہ عام قانون کے مقابلہ میں اتنا نازک ہے کہ امام مالکؒ نے چالیس سوالات میں سے ۳۳ کے بارے میں کہا تھا "لا ادری" یعنی مجھے معلوم نہیں۔ پھر تو میرے اور آپ جیسے خادمانِ اسلام کے لیے تو بطریقِ اولیٰ "لا ادری" کہنا اس بات سے ہزار درجہ آسان ہے کہ ہم پیچیدگیوں میں الجھتے پھریں۔ اس میں کسی کے لیے سبکی کی کوئی بات نہیں ہے۔

اجماعِ سکوتی

خالد اسحٰق صاحب نے ابوزہرہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ "عورت کی دیت کے نصف ہونے پر اجماعِ صحابہ، اجماعِ سکوتی ہے۔ بہت سے فاضل فقہاء اس کو اجماع تسلیم نہیں کرتے (العقوبۃ لابی زاہرہ۔ ص ۶۴۶)"

جناب مکرم! اجماعِ سکوتی ہی نہیں ہے بلکہ تعامل صحابہؓ و تابعین و تبع تابعین بھی ساتھ ہے اور چودہ سو سالہ تعاملِ اُمت اور تواتر طبقہ عن طبقہ بھی ہے اور تعامل و تواتر فی الامۃ کے حجت ہونے سے فاضل تو کیا کسی غیر فاضل فقیہ نے بھی انکار نہیں کیا۔

لیکن اگر اجماعِ سکوتی ہی سمجھ لیا جائے تو پھر آئیے اس بارے میں فقہاءِ اسلام و راسخین کی آراء کا جائزہ لے لیں۔

اجماع کی تعریف اور حجیت

اتفاق امۃ محمدٍ خاصۃً علی امرٍ من الامور الدینیۃ

(المستصفیٰ للغزالی جلد ا ص ۱۷۳)

اتفاق مجتہدی امۃ محمدٍ بعد وفاتہ فی عصرٍ من الاعصار علی امرٍ من الامور (ارشاد الفحول للشوکانی ص ۷۱ ومثلہ فی الاحکام للآمدی۔ جلد ا ص ۱۰۱)

یعنی "اُمتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مجتہدین کا رسول اللہ کے بعد کسی زمانہ میں کسی حکم

شرعی پر متفق ہوجانا اجماع کہلاتا ہے۔"

اجماع کے حجت شرعیہ ہونے، اس کی جزئی تفصیلات اور دیگر متعلقہ اُمور پر یہاں بحث کرنا میرے پیش نظر نہیں ہے[1]۔ اجماع کے حجت ہونے کے بارے میں امام شافعیؒ نے (الرسالہ ص ۲۰۴ تا ۲۰۵) میں اور امام غزالیؒ نے المستصفیٰ جلد ۱ - ص ۱۷۴ تا ۱۸۰) میں تفصیلی دلائل دیئے ہیں۔ اور قرآن سنت اور عقل تینوں دلائل سے اس کا مآخذِ قانون ہونا ثابت کیا ہے۔ حنفی اُصول فقہ کی بنیادی کتاب اُصول بزدوی میں ہے کہ اجماع قطعی دلیل ہے، لیکن صحابہ کے اجماع کا مرتبہ حدیث متواتر کی طرح ہے اور بعد کے مجتہدین کا اجماع حدیثِ مشہور کی طرح ہے۔ (اُصول بزدوی ص ۲۴۵ طبع کراچی)

اِسی طرح حنفیہ کے نزدیک اجماع قولی اور عمل کا مرتبہ اگرچہ اجماع سکوتی سے بلند تر ہے مگر اجماع سکوتی بھی حجت قطعیہ ہے لیکن درجہ رخصت میں۔ (اصول بزدوی ص ۲۳۹ باب الاجماع نیز التقریر والتحبیر شرح تحریر الاصول جلد ۳ ص ۸۰ تا ۹۲)۔

اجماعِ سکوتی کے بارے میں دیگر ائمہ کی آراء

قاضی شوکانیؒ نے اس سلسلے میں ۱۲ اقوال نقل کیے ہیں، لیکن یہ تمام آراء اس بات پر متفق ہیں کہ اگر ایسے واضح قرائن موجود ہوں جن سے معلوم ہوتا ہو کہ خاموشی اختیار کرنے والوں نے اس رائے کو پسند کر لیا ہے جو پیش کی گئی تھی، مثلاً جس مجتہد نے رائے پیش کی تھی اُس کے سارے ہم عصر لوگ ختم ہو گئے، لیکن آخر تک کسی نے اس کے خلاف آواز نہ اُٹھائی ہو تو یہ واضح قرینہ ہے کہ وہ سب متفق تھے، ورنہ بعد میں کسی وقت تو اختلاف کا اظہار کر لیتے۔

چند آراء ملاحظہ کیجیے:

۱۔ اجماع سکوتی نہ اجماع ہے اور نہ حجت ہے۔ امام غزالیؒ، علامہ آمدیؒ اور امام رازیؒ نے کہا ہے کہ یہی امام شافعیؒ کا قول ہے۔ امام جوینی نے کہا ہے کہ یہی ان کا ظاہر مذہب ہے

[1] "اجتہاد اور اوصاف مجتہد" کے موضوع پر میں نے ایک الگ مقالہ لکھا ہے، جو اغلباً ترجمان القرآن میں شائع ہوگا۔ انشاء اللہ (صاحبِ مضمون)

۲ ــــ اجماع تو نہیں ہے مگر اجماع سے کم درجے کی دلیل ہے۔ یہ شافعیؒ کا ایک قول اور شافعیہ کی ایک جماعت کی رائے ہے۔ ابو اسحٰق شیرازیؒ اور ابو حامد اسفرائینی فرماتے ہیں کہ اجماع سکوتی پر عمل کرنا تو واجب ہے اور یہ حجت بھی ہے، مگر اسے اجماع کا نام دینے میں ہمارے اصحاب کا اختلاف ہے۔ علامہ آمدیؒ نے اسی رائے کو پسند کیا کہ حجت تو ہے مگر اسے اجماع نہیں کہا جاسکتا۔

۳ ــــ اگر ہمعصر لوگ ختم ہو گئے ہوں اور کسی نے مخالف رائے کا اظہار نہ کیا ہو تو اجماع کے درجے کی حجت شمار ہوگی۔ یہ احمد بن حنبل کا بھی ایک قول ہے، ابن فورک، ابوطاہر بغدادی، امام رافعیؒ اور ابو اسحٰق شیرازیؒ نے اسی کو صحیح مسلک قرار دیا ہے اور اکثر شافعیہ کی رائے بھی یہی ہے۔

۴ ــــ اگر ایسے قرائن موجود ہوں جن سے خاموش رہنے والے فقہا کی پسندیدگی اور اتفاق ثابت ہوتا ہو تو یہ اجماع کے درجے کی حجت شمار ہوگی۔ (ارشاد الفحول از شوکانیؒ ص ۸۴-۸۵ بحث حادی عشر)

عمر فاروقؓ کے دورِ خلافت میں آزادیٔ رائے کے معیاری ماحول سے خالد اسحٰق صاحب بخوبی واقف ہیں۔ یہاں تک کہ جلسۂ عام میں ایک عورت بھی تنقید کر لیتی تھی۔ اگر ان کا یہ قانون اور فتویٰ بے بنیاد ہوتا تو اسی وقت اس کے خلاف آواز اٹھتی، لیکن اُن کی زندگی میں بھی اور حضرات عثمانؓ و علیؓ کے دورِ خلافت میں بھی اس کی مخالفت کسی نے نہیں کی۔ تو کیا یہ بھی اجماع سکوتی ہے۔ علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین اور اِقْتَدُوْا بِالَّذِیْنَ مِنْ بَعْدِیْ اَبَا بَکْرٍ وَّ عُمَرَؓ "میرے سنّت کی پیروی کرو اور میرے خلفاء راشدین کی پیروی کرو" اور "اُن دو کی پیروی کرو جو میرے بعد رہیں گے یعنی ابابکرؓ اور عمرؓ کی"۔

مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کی "مشکل" کا جائزہ

خالد اسحٰق فرماتے ہیں کہ مولانا ظفر احمد عثمانیؒ اعلاء السنن میں "غیر مسلم کی دیت کو مسلمان کی دیت کے برابر اور مسلمان عورت کی دیت کو نصف سمجھنے کے خیال کے ساتھ اتفاق کرنے میں کافی مشکل محسوس کرتے ہیں"۔

مولانا کو تو کوئی مشکل محسوس نہیں ہوئی - ذمی اور معاہد کی دیت کو مسلمان کی دیت کے برابر ثابت کرنے کے لیے انھوں نے احادیث اور روایات نقل کی ہیں اور عورت کی دیت کے نصف ہونے پر اُنھوں نے روایات بھی نقل کی ہیں اور اجماع صحابہ بھی نقل کیا ہے - ان کی بات کو سمجھنے کی پھر کوشش کریں - انشاء اللہ آپ کی مشکل حل ہو جائے گی -

سُورۃ النساء کی آیت دِیَت کا حوالہ

جناب خالد اسحٰق صاحب اس آیت (النساء ۹۲) کا حوالہ بار بار دے رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کا ظاہری اور سادہ مطلب یہ ہے کہ عورت اور مرد کی دیت برابر ہونی چاہیے - آپ کے علم کو ہم اتنا ظاہری اور سادہ کیسے مان لیں کہ ایک کھلی حقیقت کو آپ نہ سمجھ سکیں - آیت میں دِیَت کی مقدار کا سرے سے ذکر ہی نہیں ہے اور "سادہ" تو نہیں مگر حقیقی اور واضح مطلب یہ ہے کہ ہر مومن اور ذمی و معاہد کے قتلِ خطا پر دِیَت مقتول کے وارثوں کو ادا کرنا لازم ہے، خواہ مرد ہو یا عورت، بالغ ہو یا نابالغ - باقی رہی مقدار تو اس کا ثبوت سنّت رسولؐ اور سنّت اصحاب رسولؐ سے حاصل ہوتا ہے جو قرآن کی تفسیر و تشریح کا بہترین ذریعہ ہے - تفسیر بالرائے کی مذمت کی احادیث تو آپ کو معلوم ہوں گی - بقول علامہ انور شاہ کشمیریؒ (فیض الباری)، اور بقول دیگر محققین مثلاً قرطبی، ابن کثیر وغیرہما تفسیر بالرائے کے معنی یہی ہیں کہ سنّتِ رسولؐ، سنّتِ اصحابِ رسولؐ اور اجماع و تعامل و تواترِ اُمت کے خلاف وہ تفسیر کی جائے جو مفسّر کی ذاتی پسند پر مبنی ہو -

جدید رجحان کی بات

موصوف مذکور فرماتے ہیں: "اب رجحان عورت کو مرد کے برابر دِیَت دلانے کی طرف ہے"- عالمِ اسلام کے مراکزِ علم و تحقیق اور علمائے دین، مفسرین و محدثین میں سے تو کسی کا یہ رجحان ہم نے نہیں دیکھا، آپ کس رجحان کا ذکر فرما رہے ہیں - اگر مغربی ماڈل کے "دانشوروں" کی جانب اشارہ ہے یا ماڈرن ازم کی دلدادہ خواتین کی جانب اشارہ ہے تو ان نام نہاد دانشوروں اور خواتین کی تعداد ۵ فی صد سے بھی کم ہے - آپ کو انھی کا رجحان کیوں اتنا وزنی نظر آتا ہے اور ۹۵ فیصد

مسلمانوں کے رجحان پر آپ کی نگاہ کیوں نہیں پڑتی۔ اگر جدت ہی معیار ہے تو ان ۵ فی صد سے بھی کم لوگوں کا رجحان تو سود کو جائز ٹھہرانے، پردے کی پابندی ختم کرانے اور سیاست کو مذہب سے آزاد کرانے کی جانب بھی ہے۔ بلکہ ان پر ساری شریعت ہی ایک بوجھ ہے جسے یہ اُتار پھینکنے کی سعی کر رہے ہیں۔ کیا وہ تمام چیزیں جو جدید رجحان کے نام سے بیان کی جا سکیں، تفسیر و اجتہاد کی شرعی دلیل بن جائیں گی؟

امام فخر الدین رازی کا حوالہ

خالد اسحٰق صاحب نے امام رازی کا حوالہ ایسے انداز میں دیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ امام رازیؒ، الاصم اور ابن عُلیہ کو ممتاز فقہا سمجھتے ہیں اور ان کے استدلال کو قوی سمجھتے ہیں اس لیے مجبوراً مجھے رازیؒ کی پوری عبارت نقل کرنی پڑ رہی ہے:

(المسئلة الثامنة) مذهب اكثر الفقهاء ان دية المراة نصف دية الرجل وقال الاصم وابن عطيه ديتها مثل دية الرجل حجة الفقهاء ان علياً وعمرؓ وابن مسعودؓ قضوا بذالك وان المراة فى الميراث والشهادة على النصف من الرجل فكذا فى الدية - وحجة الاصم قوله تعالىٰ (ومن قتل مؤمناً خطأً فتحرير رقبةٍ مؤمنةٍ ودية مسلّمة الى اهله) واجمعوا ان هذه الآية دخل فيها حكم الرجل والمراة فوجب ان يكون الحكم فيها ثابتاً بالتسوية والله اعلم (تفسير كبير- جلد ۱۱ ص ۲۳۳ - آيت النساء ۹۲)[۱]

ترجمہ: "اکثر فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ عورت کی دیت مرد کی دیت سے نصف ہے اور الاصم اور ابن عطیہ نے کہا ہے کہ عورت اور مرد کی دیت برابر ہے۔ فقہاء کی دلیل یہ ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت عمرؓ اور ابن مسعودؓ کا یہی فیصلہ تھا۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ عورت میراث

[۱] معلوم نہیں، خالد صاحب نے کس ایڈیشن سے ۲۳۷ کا حوالہ دیا ہے۔ (صاحبِ مضمون)

اور شہادت میں مرد سے نصف ہے (جناب مخاطب نے "قدر و قیمت" کا لفظ از خود بڑھا دیا ہے) تو دیت میں بھی ایسا ہی ہے۔ اور اصم کی دلیل یہ ہے کہ اللہ کا ارشاد ہے کہ جس نے کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دیا ہو اور اس پر ایک غلام آزاد کرنا اور دیت لازم ہے جو مقتول کے وارثوں کو دی جائے گی۔ فقہا کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس آیت کے مفہوم میں مرد اور عورت دونوں داخل ہیں (اگرچہ صیغہ مذکر کا ہے) تو لازم ہے کہ حکم بھی دونوں کا برابر ہو واللہ اعلم"۔

امام رازیؒ نے تو اصم اور ابن علیہ کے استدلال کی تائید کی ہے اور نہ ان کو ممتاز فقہا کہا ہے بلکہ ان کا نام فقہا کے مقابلے میں ذکر کیا ہے اور کسی لقب کا ذکر تک نہیں کیا۔ باقی رہا یہ بات کہ مرد اور عورت دونوں اس آیت کے مفہوم میں داخل ہیں۔ اس لیے حکم بھی برابر ہونا چاہیے تو فقہا مانتے ہیں کہ جو حکم آیت میں مذکور ہے اس میں دونوں برابر ہیں یعنی "دیت کا واجب ہونا"۔ لیکن مقدار دیت کا ذکر سرے سے آیت میں موجود ہی نہیں ہے تو برابر ہونے کو کیسے تسلیم کیا جائے۔ مقدار تو دوسرے دلائل سے معلوم ہوتی ہے اور ان دلائل میں مساوات کا نہیں بلکہ فرق کا ذکر ہے۔

ابن جریر طبری کا حوالہ

سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۱۷۸ کی تفسیر میں ابن جریرؒ نے المسلمون تتکافأ دماءھم کا حوالہ دے کر یہ کہا ہے کہ آیت کا مقصد عربوں کی عادت کا مٹانا ہے اور قصاص میں برابری کا حکم دینا ہے۔ خالد صاحب نے اس بات کو بھی عورت کی دیت کے مسئلے میں نقل کیا ہے آخر ع کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا ؟

اُمّت کے لیے ممکن راستے کھلے ہیں

ہمارے محترم و ممتاز قانون دان نے تین بڑے اہم نکات لکھے ہیں۔ ایک یہ کہ اجماع کی تعریف ہی یہ ہے کہ کسی زمانے کے علما کسی اصولِ قانون کے بارے میں بالارادہ متفق الرائے

ہو جائیں جو قرآن یا سنّتِ ثابتہ سے متصادم نہ ہو۔ دوسرا یہ کہ اُمت کے لیے کوئی یا تمام ممکن راستے اختیار کرنے کی راہ کھلی ہے جس کے لیے سنّت جو قرآن سے متصادم نہ ہو موجود ہو۔ تیسرا یہ کہ بالارادہ اجماع کبھی موجود نہیں تھا۔ روایات ایک دوسرے سے متضاد ہیں .... اور دو اور احادیثِ ثابتہ کے خلاف ہیں۔ پس یہ اُمت کی ذمہ داری بن جاتی ہے کہ وہ ایسے قاعدے کو تسلیم کرے جو متن قرآن کے سادہ مطلب کے نزدیک ہو۔"

پہلی بات کے متعلق تو عرض یہ ہے کہ "قرآن یا سنّتِ ثابتہ سے متصادم بات پر تو اُمت کا اجماع ممکن ہی نہیں ہے۔ رسول اللہ سے معنوی تواتر کے ساتھ منقول ہے کہ "میری ساری اُمت گمراہی پر متفق نہیں ہو سکتی" اور "میری اُمت میں وقت مقررہ تک ایک گروہ حق پر ضرور قائم رہے گا" وقت مقررہ وہ ہے جب قیامت قریب تر ہو گی تو اُس وقت اللہ کا نام لینے والا باقی نہیں رہے گا۔ اُصولِ قانون، اور متصادم نہ ہونے کے الفاظ اجماع کی تعریف میں اپنی طرف سے بڑھا دیئے گئے ہیں۔ اجماع بالارادہ بھی ہوتا ہے، سکوتی بھی ہوتا ہے، اُصولی قاعدے پر بھی ہو سکتا ہے، جزئی مسئلے پر بھی ہو سکتا ہے اور قرآن و سنّت کی تعبیر و تاویل پر بھی ہو سکتا ہے، لیکن قرآن و سنّتِ ثابتہ کے خلاف کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ اور نہ ایسا کبھی ہوا ہے اور نہ کبھی ہو گا۔ وقتِ مقررہ تک!

دوسری بات کے متعلق عرض یہ ہے کہ جس راستے کے لیے سنّت جو قرآن سے متصادم نہ ہو موجود ہو وہ راستہ یقیناً کھلا ہے اور زیرِ بحث مسئلے میں سنّتِ ثابتہ ہی کی بنا پر اُمت نے عورت کی دیت کو مرد کی دیت سے نصف قرار دیا ہے۔ یہ بات تو خود آپ کے خلاف جاتی ہے۔

تیسری بات کے متعلق عرض یہ ہے کہ جیسا کہ بیان ہو چکا ہے قتلِ نفس کی دِیت کے بارے میں نہ روایات میں تضاد ہے اور نہ رسول اللہ کی حدیث اُن کے خلاف ہے۔ قرآن کا مطلب صرف یہ ہے کہ مرد اور عورت دونوں کے قتلِ خطا کی دِیت لازم ہے اور اُمت اُسی کی قائل ہے۔ رہی مقدار سو اس کا مدار سنّت پر ہے۔

معاشرتی دلائل

خالد اسحٰق صاحب نے عورت کی دِیت کے نصف ہونے کے عقلی دلائل پر تنقید کرتے ہوئے لکھا

ہے کہ " اس مسئلے کی حمایت میں جو معاشرتی دلائل دیئے جاتے ہیں، ان کی کیا قدر و قیمت ہے"؟

فقہاء اور ماہرین اسرار شریعت نے دیت کے نصف ہونے کے لیے "معاشرتی دلائل" نہیں بلکہ "معاشی اور اقتصادی دلائل" دیئے ہیں۔ اسلامی معاشرے میں عورت کو اس کی جنس کی وجہ سے کم تر، حقیر اور ذلیل نہیں سمجھا جاتا۔ یہ تو جاہلی اور غیر اسلامی معاشروں کی خصوصیت ہے جسے اسلام نے آکر مٹایا ہے۔ انسانی کرامت و شرافت اور بنیادی انسانی حقوق میں مرد اور عورت برابر ہیں۔ ایمان و تقویٰ اور علم و فضل اور اخلاق و کردار میں اگر عورت کسی مرد سے آگے ہے تو اُس کا درجہ عنداللہ بھی اور اسلامی معاشرے میں بھی اُس مرد سے بڑا ہے۔

ازواجِ رسولؐ، بناتِ رسولؐ اور صحابیات کی جو قدر و قیمت اور عزت و احترام اور مرتبہ و مقام مسلمانوں کے دلوں میں ہے وہ آج کے کروڑوں مردوں کو حاصل نہیں ہے۔ ہر دور میں ایسی خواتین موجود رہی ہیں اور آج بھی ایسی خوش قسمت خواتین موجود ہیں جو مجھ جیسے مردوں کے مقابلے میں معاشرے میں اُونچا مقام رکھتی ہیں۔ لیکن اس بات کا تعلق دیت کے مسئلے سے نہیں ہے۔ اِس کی بنیاد تو اُس معاشی کفالت پر رکھی گئی ہے جس کے بارے میں آپ نے خود تسلیم کیا ہے کہ "معاشی کفالت کا بوجھ مسلسل مرد پر ہی ڈالا گیا ہے جب کہ عورت پر ایسا کوئی بوجھ ذمہ داری کے طور پر نہیں ڈالا گیا ہے"۔ آپ نے خود لکھا ہے کہ "عورت کو وراثت میں مرد کا نصف حصہ دینے کی یہی علت ہے"۔

دیت کے نصف ہونے کی بھی یہی علت اور مصلحت ہے کہ مرد پر چونکہ معاشی کفالت کا بوجھ ڈالا گیا ہے اور وہ محنت و مشقت کرنے اور کمانے کی صلاحیت بھی زیادہ رکھتا ہے۔ اس کے قتل ہو جانے سے پسماندگان کو نسبتاً زیادہ معاشی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اسی بنا پر مرد کی دیت زیادہ مقرر کی گئی ہے۔ اور عورت پر آپ مانتے ہیں کہ معاشی کفالت کی ذمہ داری نہیں ہے (عام حالات میں) اور بالعموم عورت کمانے کی صلاحیت بھی کم رکھتی ہے بلکہ عام اور اکثر حالات میں مرد کماتے ہیں اور عورت کھاتی ہے، اس وجہ سے دیت نصف مقرر کی گئی ہے۔ کیونکہ اس کے قتل ہو جانے سے پسماندگان کو کچھ زیادہ معاشی اور مالی پریشانی سے دوچار ہونا نہیں پڑے گا۔ بلکہ وہی مالی حالت ہوگی جو پہلے تھی، اچھی تھی یا بُری۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ آج کل تو عورتیں مردوں سے زیادہ

کماتی ہیں ۔ آپ خود قانون دان ہیں اور جانتے ہیں کہ قانون بناتے وقت اکثریت کی حالت کو ملحوظ رکھا جاتا ہے ۔ شاذ ونادر صورتوں کا خیال نہیں رکھا جاتا، بلکہ شاذ ونادر صورتوں کے لیے کوئی استثنائی دفعہ رکھی جاتی ہے اور ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اس نوع کی استثنائی صورتوں میں عدالت حالات وکوائف کا جائزہ لے کر نصف دیت سے زائد بھی بطور تعزیر دلا سکتی ہے۔ شریعت میں اس کی گنجائش ہے اور اس کے نظائر بھی موجود ہیں۔

خالد اسحٰق صاحب نے کہا ہے کہ معیشت کے نقطۂ نظر سے یہ دلیل درست نہیں ہے اس لیے کہ عورت گھر کو سنبھالتی ہے اور گھر کا کام بلا اجرت کرتی ہے۔ حیرت ہے کہ معاشی کفالت کا مالی بوجھ اٹھانے اور گھر کا کام کرنے کے درمیان موصوف نے کوئی فرق محسوس نہیں کیا۔ گھر کا کام تو عورت کرتی ہے، لیکن اس گھر اور اس کا اندرونی کام کرنے والی کو تحفظ کون دیتا ہے؟ گھر کی ضروریات اور اشیائے استعمال کون فراہم کرتا ہے؟ نیز عورت یہ کام بلا اجرت تو نہیں کرتی۔ ایسا تو نہیں ہے (بالعموم) کھاتی تو اپنا ہو اور کام مردوں کا کرتی ہو۔ اگرچہ بیوی، بیٹی، بہن اور ماں وغیرہ کی حیثیت مزدور اور نوکرانی تو نہیں ہوتی، لیکن اس کی معاشی ضروریات مرد فراہم کرتے ہیں۔ تو یہ گھر کو سنبھالنا اور گھر کے کام کرنا ایک طرح سے بالمعاوضہ ہے بلا معاوضہ نہیں ہے۔

یہ تو تسلیم شدہ بات اور کھلی حقیقت ہے کہ بیوی کی موت سے گھر کا انتظام خراب ہو جاتا ہے اور شوہر کا سکون و آرام بھی ختم ہو جاتا ہے۔ یہی حال گھر کی دوسری خواتین کی موت کا بھی ہے، لیکن اس کی تلافی تو نہ قصاص سے ہوتی ہے، نہ پوری دیت دلوانے سے اور نہ آدھی دیت دلوانے سے ہوتی ہے۔ اس کا علاج تو صبر ہے اور متبادل انتظام کرنا ہے۔ دیت تو مالی پریشانی کی تلافی کے لیے ہے، جو عورت کی موت سے کم پیش آتی ہے اس لیے دیت بھی کم رکھی گئی ہے۔ اس کمی کی بنیاد عورت کی معاشرتی کمتری نہیں ہے۔ بلکہ معاشی کفالت اور مالی پریشانی کی تلافی اس اس کی بنیاد ہے۔ اتنی واضح اور معقول بات کے لیے باریک بحثوں کی آخر کیا ضرورت ہے۔

عورت کی میراث کا مسئلہ

اس نکتے پر اظہار خیال کرتے ہوئے ہمارے نامور قانون دان دوست یہ بھی فرماتے ہیں کہ

"جہاں یہ آیت (سورۃ النساء کی آیت نمبر ۱۱) ایک لڑکے کو دو لڑکیوں کے برابر حصّہ دلاتی ہے وہیں جس شخص کی وراثت تقسیم ہوتی ہے اس کی ماں اور باپ کا حصّہ اس آیت نے برابر برابر مقرر کیا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہی آیت جس پر عورت کی کمتری کے خیال کا انحصار کیا جاتا ہے وہ آیت مرد اور عورت کے درمیان کسی بنیادی کمتری یا برتری کے حق میں نہیں ہے۔"

ہمارے فقہا نے عورت کی دیت کے مسئلے میں میراث اور شہادت کے مسئلے کا ذکر استطراداً کر دیا ہے، ورنہ اصل دلیل تو حدیثِ رسولؐ، اجماع صحابہ اور مذکورہ عقلی دلیل ہے۔ خالد اسحٰق صاحب نے میراث کے مسئلے کو اس طرح لیا ہے جیسا کہ دیت کے نصف ہونے کی اصل دلیل ہی یہ ہو۔ اس سلسلے میں پہلی عرض تو مجھے یہ کرنی ہے کہ کمتری کو آپ بار بار کس مقصد کے لیے دہرا رہے ہیں (شاید صنفِ نازک کے نازک جذبات کو ملحوظ رکھ کر؟) - عورت کی معاشرتی کمتری کا ذکر تو کسی نے بھی نہیں کیا۔ اور نہ بنیادی انسانی حقوق میں کوئی اس کو کمتر سمجھتا ہے۔ یہ حقوق تو خدا کے دیئے ہوئے ہیں، ان کو کون چھین سکتا ہے؟ اگر چھینتا ہے تو اسلامی ریاست عورت کی داد رسی کرے گی۔ بات صلاحیتوں اور ذمہ داریوں کی ہو رہی ہے۔ درمیان میں بار بار کمتری کا جذباتی لفظ کیوں آ داخل ہوتا ہے؟ میراث میں عورت کا حصّہ جو مرد سے کم مقرر کیا گیا ہے اس کی وجہ کمتری کسی نے بھی بیان نہیں کی، بلکہ معاشی ذمہ داری اور کفالت میں فرق پر اس کی بنیاد ہے۔ ماہرینِ علومِ شرعیہ اور احکامِ شرعیہ کی مصالحِ عقلیہ بیان کرنے والوں نے یہی عقلی توجیہ کی ہے۔ دیت اور میراث کے دونوں مسئلوں میں، وہ نہیں جو آپ اُن کی جانب منسوب فرما رہے ہیں۔

دوسرا مقامِ افسوس یہ ہے کہ آپ سے اُمید نہیں کی جا سکتی تھی کہ آیت کے ایک ٹکڑے کو درمیان سے لے کر اس کا نامکمل مفہوم بیان کریں گے اور قارئین کے لیے غلط فہمی کا امکان پیدا کر دیں گے۔ یہ صورت آپ کی شان کے مناسب نہیں ہو سکتی۔ غالباً نادانستگی میں ایسا ہوا ہوگا۔

آپ کی ذکر کردہ وہ آیت (النساء - ۱۱) جس میں یہ آیا ہے کہ اگر مورث (میّت) کی کچھ اولاد ہو تو اُس کی ماں اور باپ دونوں کو چھٹا چھٹا ($\frac{1}{6} + \frac{1}{6}$) حصّہ ملے گا اور اگر اس کی اولاد نہ ہو اور ماں باپ ہی اُس کے وارث ہوں تو پھر اُس کی ماں کو ایک تہائی ملے گا (اور باقی دو تہائی باپ کو دیا جائے گا) اور اگر میّت کے ایک سے زیادہ بھائی یا بہن زندہ ہوں تو پھر اس کی ماں کو چھٹا حصّہ ملے گا (اور باقی

۵/۶ حصّے باپ کو ملیں گے بہن بھائیوں کو کچھ نہیں ملے گا)، اسی ایک آیت میں (النساء نمبر ۱۱) چار صورتوں میں عورت کا حصّہ مرد سے کم مقرر کیا گیا ہے۔ اور اس کے بعد آیت نمبر ۱۲ میں شوہر کا حصّہ بیوی کی میراث میں نصف مقرر کیا گیا ہے جبکہ مرنے والی بیوی کی کچھ اولاد موجود ہو، اور چوتھا حصّہ مقرر کیا گیا ہے جب کہ اولاد موجود نہ ہو۔ لیکن بیوی کا حصّہ شوہر کی میراث میں چوتھا ہے جب کہ اُس کی اولاد نہ ہو۔ اور آٹھواں حصّہ مقرر کیا گیا ہے جب کہ اولاد موجود نہ ہو۔ حاصل یہ ہے کہ ان دو آیات میں پانچ صورتوں میں عورت کا حصّہ مرد سے کم مقرر ہوا ہے اور صرف دو صورتوں میں دونوں کا حصّہ برابر مقرر کیا گیا ہے۔ ایک ماں باپ کا حصّہ جب مورث کی کچھ اولاد موجود ہو، اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ باپ کی کفالت کی ذمہ داری اولاد پر ہوتی ہے۔ اور رشتے میں بھی اولاد (فُروع) باپ کے مقابلے میں قریب سمجھی جاتی ہے، اس لیے اصل وارث اولاد ہے۔ ماں باپ کو صرف رشتے کی وجہ سے کچھ دیا گیا ہے۔ معاشی ذمہ داریوں کی وجہ سے نہیں۔ اور چونکہ رشتے میں ماں اور باپ دونوں برابر ہیں، اس لیے دونوں کا حصّہ برابر برابر مقرر کیا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر مورث کی اولاد نہ ہو تو اس صورت میں باپ کو ۲/۳ اور ماں کو ۱/۳ ملے گا۔ اور اگر مورث کی اولاد تو نہ ہو لیکن اس کے بہن بھائی ایک سے زائد موجود ہوں تو اس صورت میں باپ کو ۵/۶ اور ماں کو ۱/۶ ملے گا کیونکہ میّت کے بہن بھائی اس کے باپ کی اولاد ہیں، جن کی معاشی کفالت کا بوجھ اُس پر ہوگا تو حصّہ بھی ماں سے زیادہ مقرر کیا گیا۔

دوسری مساوات والی صورت یہ ہے کہ کلالہ مرد یا کلالہ عورت کے اخیافی بہن بھائی کے حصّے مساوی مقرر کیے گئے ہیں۔ (النساء آیت نمبر ۱۲) اخیافی وہ ہوتے ہیں جو ماں کی طرف سے بہن بھائی ہوں، باپ دونوں کا ایک نہ ہو۔ یہاں بھی معاشی ذمہ داری چونکہ عام حالات میں اُن پر نہیں ڈالی گئی، بلکہ عُصبات پر ڈالی گئی ہے اور رشتے میں دونوں برابر ہیں اس لیے حصّہ بھی برابر برابر مقرر کیا گیا ہے۔

محترم جناب خالد صاحب کی نظر ان دو صورتوں پر پڑی ہے لیکن باقی صورتیں جن میں عورت کا حصّہ مرد سے کم مقرر کیا گیا ہے، ان کو کوئی خاص اہمیت اپنے مضمون میں نہیں دی۔ اور وہ قاری کی توجہ سے اوجھل رہ گئی ہیں۔ بہر حال یہ محض چند اشارات ہیں، میراث کے مسائل کی

تفصیل اور ان کی حکمتیں اور علل بیان کرنا تو اس وقت میرا موضوع نہیں ہے۔

نکاح کے معاملے میں مرد کی فوقیت

جناب خالد اسحٰق صاحب تسلیم کرتے ہیں کہ" قرآنی آیت نکاح کے معاملے میں مرد کو ایک حد تک فوقیت یا برتری عطا کرتی ہے"۔ لیکن ان کی توجہ اس طرف نہیں گئی کہ قرآنی آیت واضح طور پہ اس برتری کی علت بھی بیان کر دیتی ہے۔

جناب دلچسپ بات یہ ہے کہ یہاں تو آپ نے اپنے خلاف خود دلیل فراہم کر دی جس علت کا ذکر آپ نے نہیں کیا وہ قرآن نے بیان کر دی ہے۔ یہ کہ مرد صلاحیتوں میں بھی عورت سے فائق ہے اور معاشی کفالت کی ذمہ داری بھی اُسی پر ڈالی گئی ہے، عورت پہ نہیں ڈالی گئی۔ اس لیے مرد کی موت سے خاندان کو معاشی پریشانیوں کا سامنا زیادہ کرنا پڑے گا پس دیت کی مقدار زیادہ ہونی چاہئے۔ بصورتِ دیگر عورت کی موت سے معاشی اور مالی پریشانیاں کم درجے میں ہوں گی، اس لیے دیت بھی کم ہونی چاہیے۔

کیا دیت سزائے موت کا بدل ہے؟

خالد اسحٰق صاحب فرماتے ہیں کہ" دیت سزائے موت (یا قصاص) کا بدل ہے۔ چونکہ اصل نقصان (موت) میں مرد اور عورت برابر ہیں اور ایک ہی طرح کے قصاص کے حق دار ہیں تو ہم سادہ سی عقلی دلیل کی بنا پر دیت کو کم نہیں کر سکتے کیونکہ اس سے پوری طرح اُس نظریۂ مساوات کی خلاف ورزی ہو جائے گی جو قرآن میں واضح طور پہ بیان کر دیا گیا ہے"۔ (سورۃ نمبر ۵ آیت ۴۵ اور سورۃ نمبر ۴ آیت ۹۲)۔

میں سوچتا ہوں کہ کیا سچ مچ یہ اندازِ تحریر کسی ماہر قانون اور علم دوست دانشور کے شایانِ شان ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ قتلِ خطا میں سزائے موت سرے سے مقرر ہی نہیں کی گئی تو دیت اس کا بدل کیسے قرار پا گئی۔ قتلِ عمد میں اصل حکم دیت کی ادائیگی ہے نہ یہ کہ اصل حکم تو قصاص کا ہے اور دیت اس کا بدل ہے۔ غور طلب امر یہ ہے کہ دیت کی ادائیگی عاقلہ پر واجب ہے، قاتل پہ واجب

نہیں ہے۔ اگر یہ قصاص کا بدل ہوتی تو قاتل سے لی جاتی تاکہ وہ مالی بوجھ برداشت کرکے اپنے آپ کو موت سے بچائے۔ دراصل قتلِ خطا قتلِ عمد کی طرح کا گناہ یا جرم نہیں جو دیدہ دانستہ کیا گیا ہو، بلکہ صرف بے احتیاطی ہے اور چونکہ انسانی جان کا معاملہ ہے اس لیے بہت بڑی بے احتیاطی ہے۔ ایسی بے احتیاطی اپنی جگہ ایک قابلِ سزا جرم قرار پائی ہے مگر جُرم قتلِ عمد کی طرح نہیں۔ اس کے بدلے میں اُس پر کفارہ واجب ہوتا ہے جس سے مقتول کے وارثوں کو مالی امداد مل جاتی ہے۔ یہ مالی کفارہ اجتماعی کفالت کے اُصول پر قاتل کے خاندان یا اُس کے ہم پیشہ لوگ ادا کریں گے۔ اگر عاقلہ موجود نہ ہو تو قومی خزانے سے دیت ادا کی جائے گی، قاتل سے پھر بھی نہیں لی جائے گی۔ اس کے برعکس قتلِ عمد میں اصل حکم سزائے موت دینے اور قصاص لینے کا ہے۔ اگر مقتول کے وارثوں اور قاتل کے درمیان راضی نامہ ہوجائے تو مصالحت کے مطابق طے کردہ رقم قاتل خود ادا کرے گا۔ کیونکہ یہ رقم قصاص کا بدل ہے۔ قتلِ عمد کی صورت میں بدلِ صلح کی رقم مرد اور عورت کے لیے برابر بھی ہوسکتی ہے اور کم و بیش بھی ہوسکتی ہے۔

خالد اسحٰق صاحب نے سورۂ مائدہ کی جس آیت کا حوالہ دیا ہے (نمبر ۴۵) اس میں قصاص میں مساوات کا حکم دیا گیا ہے، اور سورۂ النساء کی جس آیت (نمبر ۹۲) کا حوالہ دیا ہے اس میں صرف یہ حکم دیا گیا ہے کہ قتلِ خطا کی صورت میں مومن اور معاہد کی دیت اس کے وارثوں کو دی جائے اور دیت کے واجب الادا ہونے میں مرد، عورت، مسلمان اور معاہد (ذمی اور مستأمن بھی) سب برابر ہیں۔ اصل زیرِ بحث مسئلہ مقدار کا ہے اور اس میں مساوی ہونے کا ذکر قرآن میں موجود نہیں ہے۔ آپ جیسے قانون دان سے توقع کی جاسکتی ہے کہ قانونی باریکیوں پر نگاہ رکھیں گے۔ یہ بحث جلسہ میں تقریر کی طرح تو نہیں ہے۔

نصف دیت کی دلیل کو خالد اسحٰق صاحب سادہ سی عقلی دلیل کا نام دیتے ہیں، حالانکہ ہم ثابت کرچکے ہیں کہ اس بارے میں حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی موجود ہے، اجماعِ صحابہؓ اور تعاملِ اُمت بھی موجود ہے اور واضح قسم کی عقلی دلیل بھی موجود ہے۔

نکاح پر کنٹرول کا مسئلہ

صاحبِ موصوف نے بغیر کسی وجہ کے طلاق و خلع کی بحث چھیڑ دی ہے اور کہا ہے کہ "اگر طلاق

دینا مرد کا حق ہے تو عورت کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ طلاق لے سکتی ہے اور وہ یک طرفہ طور پر خلع کا مطالبہ بھی کر سکتی ہے جس کی مدافعت نہ خاوند کر سکتا ہے اور نہ قاضی اس مطالبے کو روک سکتا ہے، بشرطیکہ وہ قاضی کے سامنے یہ ثابت کر دے کہ وہ خاوند کے ساتھ رہنا چاہتی ہے اور عقدۂ نکاح کو فسخ کرانا چاہتی ہے (پی - ایل - ڈی سپریم کورٹ صفحہ ۹۷ سال ۱۹۶۷ء کا فیصلہ ملاحظہ کر لیا جائے) پس یہ دلیل کہ نکاح پر مرد کو کنٹرول حاصل ہے، محلِ نظر ہے۔ کیونکہ یہ مسئلہ قانون کی رُو سے ثابت شدہ نہیں ہے۔

یہ طویل اقتباس (ترجمہ سے) میں نے اس لیے نقل کیا ہے کہ قارئین خالد اسحٰق صاحب کا ذہن پڑھ لیں۔ آخر عورت کی دیت کے نصف ہونے کی دلیل یہ کیسے ہوئی کہ نکاح پر کنٹرول مرد کو حاصل ہے یا نہیں۔ طلاق اور خلع کے مسائل کے ساتھ دیت کے مسئلے کا کیا تعلق؟ طلاق، خلع، فسخِ نکاح، حقوقِ زوجین کے مسائل میں تفصیلات اور قانونی نکات بیان کرنا اس مضمون کا موضوع نہیں ہے۔

قرآن کریم، سنت رسولؐ اور فقہاء اسلام کی تحقیقات اور ان کے فیصلوں کو سمجھنے کی جو تھوڑی سی سمجھ میرے رب کریم نے دی ہے، اس غیر متعلق بحث کے سلسلے میں بھی چند اشارات کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

۱ ــ قرآن کے لفظ "بیدہ عقدۃ النکاح" کا مفہوم تو یہی ہے کہ نکاح پر شوہر کو کنٹرول حاصل ہے، لیکن خالد اسحٰق صاحب کہتے ہیں کہ قانون کے رُو سے یہ ثابت نہیں ہے۔ معلوم نہیں ان کے ذہن میں کونسا قانون ہے؟

۲ ــ خلع کی آیت جس سیاق و سباق میں ہے اس کی روشنی میں اور خلع سے متعلق احادیثِ رسولؐ اور فقہاءِ اسلام کے فیصلوں کی روشنی میں تو خلع کی حقیقت یہ ہے کہ جب تعلقات اتنے خراب ہو جائیں کہ مصالحت کی تمام کوششیں ناکام ہو جائیں اور عورت حقِ مہر واپس کر کے طلاق لینا چاہے۔ اور شوہر بدلِ خلع وصول کر کے طلاق دیدے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ایسا کرنا یعنی مال کے بدلے میں طلاق دینا، جبکہ مطالبہ عورت کی جانب سے ہو، کوئی گناہ نہیں ہے۔ حاصل یہ ہے کہ خلع طلاق بعوض مال کا دوسرا نام ہے۔

۳ — تنسیخ نکاح کا دعویٰ یا مطالبہ جب کوئی عورت عدالتِ شرعیہ میں کرے گی تو عدالت صرف اس بناء پر تنسیخِ نکاح کا فیصلہ نہیں دے سکتی کہ عورت نے مطالبہ کیا ہے بلکہ اگر فسخ نکاح کی "شرعی وجوہ" کے موجود ہونے کے بارے میں عدالت مطمئن ہو جائے اور یہ وجوہ دعویٰ کرنے والی ثابت کر دے تو تب جا کر فسخِ نکاح کا فیصلہ دیا جائے گا۔

عورت کی نصف دیت پر احتجاج

خالد اسحٰق صاحب فرماتے ہیں کہ "دیت کے نصف ہونے پر (قرونِ اُولیٰ میں۔ وضاحت من جانب مدیر) احتجاج اس لیے نہیں ہوا تھا کہ عورت پر مرد کا تسلط قائم تھا، عورتیں قرآنی مساوات کی سطح پر نہیں پہنچی تھیں۔ کوئی اُن کے حقوق کے لیے کھڑا نہیں ہوا تھا۔ آج کل عورت خاندان میں اپنے رول اور معاشی طور پر اپنے حقوق سے زیادہ آگاہ ہے، وہ اب زیادہ تعلیم یافتہ اور ذہنی طور پر زیادہ مستعد ہے۔ اور ان کی ایک بڑی تعداد (کیا واقعی پاکستانی عورتوں کی بڑی تعداد؟) خاندان کی آمدنی میں اضافے کے لیے کام کر رہی ہیں"۔

میں پوچھتا ہوں کہ حضرت عمر فاروق رضؓ نصف دیت کا قانون نافذ کر رہے تھے، اس وقت بھی کیا عورتوں کے حق میں کوئی آواز اُٹھانے والا موجود نہیں تھا؟ ازواجِ مطہرات اور صحابیات قرآنی نظریۂ مساوات کو نہیں سمجھ سکتی تھیں یا وہ سب جناب عمر فاروقؓ اور صحابہ کرام سے ڈرتی تھیں۔ اگر ایسا تھا تو پھر صحابہ اور عمر فاروق رضؓ کی حیثیت آپ کی نظر میں کیا ہے؟ ذرا کھل کر بات کیجیے تاکہ پتہ چل سکے کہ آپ کے خیالات ہیں کیا؟ عائشہ رضؓ اور دیگر صحابیات کیا تعلیم یافتہ نہیں تھیں؟ ذہنی طور پر مستعد نہیں تھیں؟ اور کیا آج کی عورت اُن سے زیادہ تعلیم یافتہ ہے ہے؟ شاید آپ کے ذہن میں تعلیم کا نصاب اور مفہوم کچھ دوسرا ہے[1]

---

[1] یہ امر بھی غور طلب ہے کہ کیا خدا کے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو مرد کے تسلط سے نکلوانے اور اس کے پورے حقوق دلوانے میں اپنا فریضہ رسالت (نعوذ باللہ) ادا نہیں کیا؟ کیا تمام صحابہ اور خلفائے راشدین اور اہل بیت اور عشرہ مبشرہ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) سب کے سب جاہلی دور کے مردانہ تسلط کو دین قرار دیتے رہے؟ استغفراللہ۔ مدیر

بعد کے ادوار میں فقہائے اسلام اور محدثینِ عظام کی کتابوں میں عورتوں کے شرعی حقوق کی جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں اُن کو پڑھنے کی زحمت شاید آپ نے اُٹھائی ہی نہیں، ورنہ آپ آواز نہ اُٹھانے کی بات نہ کرتے[1]

عصری ضروریات اور شریعت

محترم جناب خالد اسحٰق صاحب اپنی لکھی گئی باتوں کو کئی بار دہراتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اجماع موجود نہیں ہے، حضورؐ کا حتمی فیصلہ موجود نہیں ہے، قرآنی تعلیمات مساوات کی طرف اشارہ کرتی ہیں، غیر متنازعہ احادیث بھی دِیت کی مساوات بیان کرتی ہیں وغیرہ۔ اپنے ان دعووں کے سہارے سے وہ آخر میں یہ اپیل تعمیر کرتے ہیں کہ ایسا قانون وضع کیا جائے کہ عصری ضروریات کو بہتر طور پر پورا کرے۔ ملخصاً، عصری ضروریات اور مسلم معاشرے کے عُرفِ عام کے مطابق قانون بنانا جائز ہے اور ہمارے فقہانے یہ قاعدہ شرعی اُصول کی روشنی میں بیان بھی کیا ہے۔ ابن عابدین نے اس موضوع پر رسالہ بھی لکھا ہے کہ عرف و ضرورت کے بدلنے سے قانونی تبدیلیاں کی جاسکتی ہیں۔ ابن قیمؒ نے اعلام الموقعین میں اس کے لیے باب قائم کیا ہے اور متعدد مثالیں بھی دی ہیں۔ لیکن جنابِ والا! یہ اُس وقت جائز ہے جب کہ سنّتِ رسولؐ، سنّت اصحابؓ اور اجماع اس کے خلاف نہ ہوں۔ یہاں تو نصف دِیت پر رسول اللہؐ کا حتمی فیصلہ بھی موجود ہے، تعاملِ اُمت بھی موجود ہے۔ آپ کا یہ دعویٰ تو زبردستی کا دعویٰ ہے کہ قرآن اور غیر متنازعہ احادیث دِیت کی مساوات بیان کرتی ہیں۔ اس دعوے کی تردید کر کے ٹھوس جواب پہلے دیا جاچکا ہے۔ یہ تو مشکل ہے کہ آپ ایک ہی مضمون میں ایک ہی بات کو بار بار دہرائیں اور ہمارا ہر دفعہ جواب کی تفصیل بھی دہرائی جائے۔

چند جدید مصنّفین کے حوالے

خالد اسحٰق صاحب اپنی رائے کے ثبوت میں ۱۴ سو سالہ تاریخ اسلام اور ذخیرۂ علوم دینیہ سے

---

[1] اِس بحث میں عورت کے سرپستان کی دِیت والی روایت بغیر کسی مناسبت اور ضرورت کے دوبارہ نقل کر دی گئی ہے جس کا جواب اور تشریح ہم پہلے کر چکے ہیں۔ (صاحبِ مضمون)

سوائے الاصم اور ابن علیہؒ کے کسی کی رائے پیش نہیں کر سکے۔ اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے چودھویں صدی ہجری کے چند جدید مصنفین کی آرا اپنی تائید میں بڑے زور بیان سے پیش کرتے ہیں۔ گویا کہ کوئی نایاب خزانۂ ایمان و فکر ہاتھ لگ گیا ہو۔ اس سلسلے میں ابوزہرہ، علی علی منصور، شیخ محمود شلتوت اور ابوالمعاطی حافظ ابوالفتح کی کتابوں کے حوالے پیش کیے ہیں۔ اور ان حضرات کے وہی "دلائل" نقل کیے ہیں جن کے تحقیقی جوابات سابق مضمون (ترجمان القرآن جون ۱۹۸۴ء) میں پہلے دیئے جا چکے ہیں۔ اگر کوئی نئی صحیح اور مضبوط دلیل ان کتابوں سے نقل کی جاتی تو ہم اس سے اتفاق کر لیتے۔ بصورت دیگر اس کا کماحقہ جواب عرض کرتے۔ اس کا کیا علاج کہ کوئی نئی دلیل سامنے نہیں آئی بلکہ جدید مصنفین کے ہاں بھی وہی الاصم اور ابن علیہ کی گردان ہے جسے دوہرا دیا گیا ہے۔ البتہ علی علی منصور کے حوالے سے خالد صاحب نے لکھا ہے کہ اصم اور ابن علیہؒ کے علاوہ بھی اس مساوات کی تائید بہت سے فقہاء اور محدثین نے کی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے انھوں نے نام کسی کا بھی نہیں لیا۔ یہ محض دعویٰ ہے۔ چودھویں صدی تک متذکرہ دو افراد کے علاوہ کسی بھی فقیہ اور محدث نے قتلِ نفس (بصورت خطاء) کی دِیت کے برابر ہونے کی بات نہیں کی۔ شریعت و فقہ (نعوذ باللہ) کوئی فٹ بال تو نہیں کہ جس کا جدھر جی چاہے اُسے ٹھوکریں لگاتا پھرے۔

اِس مقام پر ہماری طرف سے ایک بنیادی سوال پیش خدمت ہے جس کا جواب خالد اسحٰق صاحب کو دینا چاہیے۔ وہ یہ کہ آپ بہ حیثیت مجتہد بات کرتے ہیں یا بہ حیثیت مقلد؟ میرا خیال ہے کہ میری طرح آپ بھی اپنے آپ کو منصبِ اجتہاد پر فائز قرار نہیں دیتے ہوں گے۔ اب رہی بات بہ اصطلاحِ فقہ تقلید کی، تو حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام احمدؒ اور چودہ سو سال میں ہزاروں محدثین و فقہاء کی تقلید کے مقابلے میں، اصم، ابن علیہؒ اور دَورِ جدید کے مذکورہ چار مصنفین کی تقلید کرنا کیا عقل اور انصاف کا تقاضا ہے؟ اگر آپ یہ جواب دیں کہ یہ دَورِ جدید ہے اور نئی روشنی کا عہد ہے، اِس لیے ان چار صاحبوں کی تقلید کرنی چاہیے۔ اِس پر مَیں عرض کروں گا کہ ہزاروں علماء و فقہاء، محققین موجود ہیں جو دِیت کے نصف ہونے کے قائل ہیں۔ برصغیر ہند و پاک میں دارالعلوم دیوبند علمی مرکز ہے،

عالمِ اسلام میں کئی مراکزِ علمیہ ہیں، ان کی تقلید کیوں نہیں کر سکتے؟ علامہ سید سابق، مشہور جج اور قانون دان عبدالقادر عودہ شہید وغیرہ جدید و قدیم دونوں قوانین کے ماہرین کی بات کیوں نہیں مانتے؟ اس دور کے قابلِ اعتماد اور صاحبِ بصیرت دکھ دار علماء و مفکرین کی بھاری اکثریت کو ایک طرف چھوڑ کر چند افراد کو جن کے نقطۂ نظر پر عمومی درجے میں کامل اعتماد نہیں پایا جاتا، آپ اُمورِ شرعیہ کی زمام انہیں سونپ دینا چاہتے ہیں؟

دستوری ہدایت

خالدِ موصوف فرماتے ہیں کہ "جو دستوری ہدایت (دستورِ پاکستان کی ہدایت) اسلامی نظریاتی کونسل اور قومی مقننہ کو دی گئی ہے اس کے رُو سے حتمی سند قرآن اور سنت ہیں، کوئی دوسری آرا نہیں" (ترجمہ سے اقتباس)

جناب یہ بات تو ہمیں آپ سے کہنی تھی کہ اصم اور ابن علیہ اور دَورِ جدید کے تین چار مصنفین کی آرا کو اتنا نہ اُچھالیے بلکہ قرآن و سنت سے کوئی دلیل لایئے جس میں کہا گیا ہو کہ عورت اور مرد کے قتلِ خطا کی دِیت مساوی ہے۔ اس کے برعکس قرآن میں ہے کہ رسول اللہ کی اطاعت کرو اور جب رسول اللہؐ نے فرمادیا ہے کہ عورت کی دِیت مرد سے نصف ہے تو اس حدیث کی اطاعت قرآن کی اطاعت قرار پاتی ہے۔ نیز رسول اللہؐ نے فرمادیا ہے کہ میرے بعد ابوبکرؓ اور عمرؓ اور خلفاءِ راشدینؓ کی سنت کی پیروی کرو اور میری اُمت جس بات پر بھی متفق[1] (کسی ایک زمانے میں بھی) ہو جائے وہ گمراہ نہیں ہوگی، بلکہ خود قرآن نے کہا ہے کہ مسلمانوں کے اجماعی راستے کے خلاف جانے والا جہنم کی طرف جا رہا ہے۔ اس لیے اجماعِ اُمت کی بات ماننا قرآن و سنت ہی کی بات ماننا ہے۔ اور سنتِ ابوبکرؓ و عمرؓ کی اطاعت سنتِ رسولؐ کی اطاعت ہے۔

عورتوں کی شہادت کا مسئلہ

عورت کی دِیت کے مسئلے سے شہادت کے مسئلے کا براہِ راست تعلق نہیں ہے۔ بعض فقہاءؒ نے دِیت

---

[1] دینی اُصولوں کے تحت علمی حیثیت سے۔ (مدیر)

کے مسئلے میں شہادت کے نصف ہونے کا ذکر استطراداً کیا ہے، استدلالاً نہیں۔ لیکن جناب خالد اسحٰق صاحب نے اِس مسئلے کو دیت کی بحث میں چھیڑ دیا ہے۔ اُن کا جو مضمون عبارت میں شائع ہوا تھا اُس کا کافی اور تحقیقی جواب نیوٹاؤن کے مدرسے کے فاضل مفتی صاحب نے عبارت ہی میں دے دیا ہے۔ مجھے اس پر مزید کچھ لکھنے کی فی الحال ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اس مضمون کے موضوع سے اس بحث کا کوئی تعلق بھی نہیں ہے۔ تاہم چند مختصر اشارات عرض کیے دیتا ہوں۔

۱۔ جن اُمور کا علم عورتوں ہی کو ہو سکتا ہے اور اُن کے بارے میں مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی رائے زیادہ وزنی سمجھی جاتی ہے۔ ان میں صرف عورتوں کی شہادت بھی قبول کی جا سکتی ہے مثلاً ولادت یا بکارت وغیرہ اُمور۔ امام احمدؒ کے نزدیک رضاعت کے معاملے میں بھی تنہا ایک عورت کی گواہی قبول کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا یہ غلط پروپیگنڈا ہے کہ علماء عورت کی شہادت قبول ہی نہیں کرتے۔

۲۔ فوجداری مقدمات میں (حدود و قصاص) "قرائنِ قطعیہ" جن کی بنا پر قاضی کو یقین کامل حاصل ہو جائے کہ عورت کی یہ گواہی واقعات کے مطابق ہے تو ایسی صورت میں حدود میں بھی عورت کی گواہی قبول کی جا سکتی ہے لیکن قرائنِ قطعیہ کے بغیر قبول نہیں ہو سکتی۔

۳۔ قرائنِ قطعیہ کے بغیر بھی اگر عورتوں نے تنہا یا مرد کے ساتھ مل کر گواہی دی ہو تو حد و قصاص کا حکم تو نہیں دیا جا سکتا[1] لیکن مناسب تعزیر دی جا سکتی ہے۔ ملزم کو باعزت طور پر رہا نہیں کیا جائے گا اس لیے کہ ظنی ثبوت تعزیر[2] کے لیے تو کافی ہے مگر حدود قصاص کے لیے کافی نہیں ہے۔

۴۔ مالی لین دین (دیوانی تنازعات) کے بارے میں سورۃ بقرہ کی آیت ۲۸۲ میں ارشادِ خداوندی ہے کہ "اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی لے لو" اور وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ

---

[1] حدود کے معاملے میں ایک مرد کی گواہی بھی مسترد ہو سکتی ہے اور زنا کے مقدمات میں تو تین مردوں کی شہادت بھی کافی نہیں۔ یہ قانون کے مختلف تقاضے ہیں، ان کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ (مدیر)

[2] عجیب بات یہ ہے کہ تعزیر کو اچھے اچھے قانون دان بے وقعت سمجھتے ہیں، حالانکہ حد کی مقررہ سزا سے بسا اوقات تعزیر زیادہ سخت بھی ہو سکتی ہے۔ یہ بات ناقابلِ فہم ہے کہ لوگ غیر حقیقی مغالطوں میں کیوں پڑے ہیں۔ (مدیر)

بوقتِ ضرورت وہ ایک دوسری کو یاد دہانی کرائیں گی - آیت میں دونوں کو گواہ قرار دیا گیا ہے اور دونوں کی گواہی لینے کا حکم دیا گیا ہے، لیکن خالد اسحٰق صاحب کہتے ہیں کہ گواہ تو اصل میں ایک ہے - دوسری تو یاد دلانے کے لیے موجود رہے گی تو پھر واستشھدوا کے معنی کیا ہیں؟ قاضی ابوبکر ابن العربیؒ لکھتے ہیں کہ آیت میں احدٰھما کا تکرار اسی وہم کے ازالے کے لیے کیا گیا ہے کہ گواہی جو بھی ایک دے گی، دوسری صرف تذکیر کی ذمہ داری ادا کرے گی - ان تضل احدٰھما فتذکر احدٰھما الاخرٰی کے معنی یہ ہیں کہ جو بھی غلطی کرے گی تو دوسری یاد دہانی کرائے گی ورنہ گواہی تو دونوں کی لینی ہوگی - (احکام القرآن جلد ۱ ص ۲۵۶ - ۲۵۷)-

۵ - عورتوں کی گواہی کا مردوں کی گواہی سے نصف ہونے کا فیصلہ علماء نے تو نہیں کیا جن کو نشانہ بنایا جاتا ہے، بلکہ قرآنی ارشاد کی توضیح کے لیے صحیح بخاری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان موجود ہے:"

"قال الیس شھادۃ المرأۃ مثل نصف شھادۃ الرجل؟ قلن بلیٰ! .... الخ
(صحیح بخاری جلد ۱ - ص ۴۴ - کتاب الحیض، باب ترک الحائض الصوم نیز جلد ۱
ص ۳۶۳ - کتاب الشھادات، باب شھادۃ النساء - طبع کراچی)

(ترجمہ) رسول اللہ نے فرمایا "کیا عورتوں کی شہادت مرد کی شہادت کا نصف نہیں ہے"؟ عورتوں نے کہا: "ہاں ایسا ہی ہے" ..... تا بہ آخر -

یہ حدیث سورۃ بقرہ کی مذکورہ آیت کی واضح تفسیر ہے، اس لیے کہ اس میں نصف شہادت کا لفظ واضح طور پر موجود ہے - خالد اسحٰق صاحب سے سوال ہے کہ کیا اس صحیح حدیث کی موجودگی میں آیت کی کوئی دوسری تفسیر کرنا "تفسیر بالرائے" نہیں ہوگی؟ قرآن کریم میں تدبر کرنا اور غور و فکر کرکے علوم و حِکم معلوم کرنا تو خود قرآن کا حکم ہے، لیکن متبادر مفہوم جس کی تائید و تشریح حدیثِ مرفوع سے بھی ہوتی ہے، اس کے خلاف رائے زنی کرنا اگر "تفسیر بالرائے" نہیں ہے تو پھر "تفسیر بالرائے" کا مفہوم کیا ہے؟

آپ کا ایک بیان میں نے اخبارات میں پڑھا تھا جس سے آپ کے ذہن کو پڑھا جاسکتا ہے - وہ یہ تھا کہ سائنس نے اتنی ترقی کی ہے کہ اب چاند تک انسان پہنچ گیا ہے، لیکن اب بھی عورت کی گواہی

کو نصف سمجھا جاتا ہے۔ محترم قانون دان! علومِ طبیعیہ الگ موضوع ہے اور علوم شرعیہ کی بحث الگ۔ آخر انسان کے چاند پر پہنچ جانے کی دلیل سے کوئی دوسرا شخص سرے سے دین یا نظامِ شریعت یا اس کے کسی بھی قانون کو نشانہ تضحیک بنا سکتا ہے۔ یہ کوئی شرعی دلیل تو نہ ہوئی کہ جب انسان چاند پر پہنچ جاتے تو آیات کے معنی بدل جائیں اور احادیث پر خطِ نسخ کھینچ دیا جائے۔

شاید آپ یوں سوچتے ہوں کہ حضورؐ کا مذکورہ ارشاد تو چودہ سو سال پہلے مدینہ کی عورتوں کے لیے تھا اور مخاطب انہی کو کیا گیا تھا۔ پھر تو دوسرا کوئی شخص یوں بھی کہہ سکتا ہے کہ تمام قرآنی احکام اور ارشاداتِ رسولؐ کے مخاطب ۱۴ سو سال پہلے کے لوگ تھے، ہم تو اس سے آزاد ہیں۔ (نعوذ باللہ)

۶ — عورت کی جسمانی، عقلی اور نفسیاتی صلاحیتوں کے متعلق تو جدید سائنس نے بھی بہت مواد فراہم کر دیا ہے۔ علامہ فرید وجدی کی کتاب "دائرۃ المعارف القرن العشرین" (یعنی بیسویں صدی کی انسائیکلوپیڈیا) کی آٹھویں جلد میں عورت پر طویل مقالہ موجود ہے اس میں یورپ کے متعدد فلسفیوں اور سائنس دانوں کی آراء مستند کتابوں سے نقل کی گئی ہیں اور عورت کی دماغی، قلبی، اعصابی اور دیگر صلاحیتوں کو اچھی طرح واضح کیا گیا ہے اسے پڑھ کر صنفین کے حقیقی اور واقعی فروق کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔

اُمید ہے کہ یہ چند اشارات بھی طالبِ حق کے لیے کافی ہوں گے۔ اگر موقع ملا اور ضرورت محسوس کی تو شہادت کے مسئلے پر بھی تفصیلی مضمون لکھوں گا۔ (ان شاء اللہ)۔

اللّٰھم ارنا الحق حقا۔ وصلی اللہ علی خیر خلقہ محمدٍ وّ علی آلہٖ اجمعین۔ وارزقنا اتباعہ آمین[1]!

---

[1] یہ مضمون یکم ذوالقعدہ ۱۴۰۴ھ مطابق ۳۰ جولائی ۱۹۸۴ء ۲ بجے شب مکمل ہوا۔ (صاحبِ مضمون)